سندھ میں کسان تحریک کا ایک اہم کردار

قاضی فیض محمد

(سوانح حیات)

مصنف:
رُک سندھی

فہرست

- دیباچہ
- شروعات
- بچپن اور تعلیم
- سیاسی زندگی کی شروعات
- مسلم لیگ میں شمولیت
- کراچی کی علیحدگی
- مسلم لیگ سے علیحدگی
- ہاری کمیٹی اور اس کے بعد
- ون یونٹ توڑ تحریک
- عوامی لیگ اور نیپ
- آل پاکستان نیشنل عوامی پارٹی
- الاٹی تحریک
- ایوبی مارشل لا
- عوامی لیگ میں اہم کردار
- 1970ء کے انتخابات اور ڈھاکہ سانحہ
- سندھی زبان کی بقا کے لیے جدوجہد
- ووٹر لسٹیں سندھی میں شائع کرانے کی جدوجہد
- سندھی زبان کو قومی زبان بنانے کی تحریک
- زندگی کے آخری دن
- ادبی اور ثقافتی زندگی
- حوالہ جات
- ماخذات

دیباچہ

سندھی زبان میں سوانحی ادب پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ آج تک سندھ میں کسی سیاستدان، شاعر یا ادیب کی باقاعدہ طور پر کوئی جامع اور مستند سوانح حیات نہیں لکھی گئی ہے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ہم اپنی نوجوان نسل کو اپنے رہنماؤں اور قائدین کی کارکردگیوں، فتوحات اور ناکامیوں سے واقف کرنے کے لیے ان کی سوانح عمریاں مرتب کرتے۔

ایسا کرنے سے ایک تو ہمارے قومی رہنماؤں کے کارنامے اور سرگرمیاں محفوظ ہو کر تاریخ کا حصہ بن جاتے، اور دوسرا یہ کہ ہماری نوجوان نسل ماضی کے تجربات اور مشاہدات سے سبق حاصل کر کے مستقبل کے لیے درست منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو سکتی۔

جب میں نے سندھ کی تاریخ پر کام شروع کیا، تو مذکورہ حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے پروگرام میں سندھ کے ہم عصر دور کی عظیم شخصیات کی سوانح حیات مرتب کرنے کا کام بھی شامل کیا۔

اس پروگرام کے تحت ابتدا میں سندھ کے چھ قومی رہنماؤں:

(1)کامریڈ حیدر بخش جتوئی
(2)جی ایم سید
(3)شیخ عبدالمجید سندھی
(4)مولانا عبیداللہ سندھی
(5)قاضی فیض محمد
(6)کامریڈ غلام محمد لغاری

کی سوانح حیات لکھنے کا کام شروع کیا۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب "قاضی فیض محمد "آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ باقی بھی جلد شائع کر کے منظر عام پر لائے جائیں گے۔

قاضی فیض محمد، سندھ وطن کے سچے خادم، محنت کشوں کے ہمدرد اور بہترین ساتھی تھے۔ وہ تمام عمر سندھی قوم کی بقا اور اس کے حقوق کے تحفظ کی جنگ میں شامل رہے۔ جب بھی، جہاں بھی، یہاں کے محنت کش عوام کے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد ہوئی، وہ اس میں قیادت کا کردار ادا کرتے رہے۔ ان کی سندھ دوستی اور یہاں کے ہاریوں اور مزدوروں سے محبت ہر مذہب اور مسلک سے بالاتر رہی۔ وہ نہایت جدوجہد کرنے والے انسان تھے، زندگی کی آخری گھڑی تک حق اور سچ کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ ان کے قول و فعل سندھ کی قومی تاریخ میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔

ایسے قابل فخر اور عزت کے لائق انسان کی سوانح حیات لکھتے ہوئے، میں نے ان کے ساتھ کتنا انصاف کیا ہے، اس کی گواہی یہ کتاب دے گی۔ میں کوئی دعویٰ نہیں کرنا چاہتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ آج تک سندھی ادب میں ایسی جامع اور مستند سوانح حیات شاید ہی لکھی گئی ہو۔ میں نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تصدیق شدہ مواد استعمال کرتے ہوئے، بہت کم صفحات میں قاضی صاحب کی زندگی کے ہر پہلو سمیت ان کے دور کی سیاست کا مختصر نقشہ بھی واضح کیا جائے۔ تاکہ قارئین نہ صرف قاضی صاحب کی زندگی بلکہ اس دور کے اہم سیاسی نشیب و فراز اور واقعات سے بھی واقف ہو سکیں۔

مجھے امید ہے کہ میری یہ محنت سندھ کے اہلِ دل کو پسند آئے گی۔

رُک سندھی
25مئی 1985ء

قاضی فیض محمد
(سوانح حیات)

پیدائش 23 :نومبر 1908ء — ہالاٹي، تعلقہ کنڈیارو
وفات 13 :اکتوبر 1982ء — ہالاٹي، تعلقہ کنڈیارو

شروعات

بیسویں صدی پوری انسانیت کے لیے انقلابی اور تیز رفتاری کی صدی رہی ہے۔ اسی صدی کے بطن سے دو عالمی جنگوں نے جنم لیا۔ غلام قوموں نے اپنی آزادی دوبارہ حاصل کی۔ محنت کشوں نے پہلی بار عالمی نقشے پر سوشلسٹ ریاستیں قائم کیں۔ دنیا دو نظریاتی دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اسی صدی نے جہاں کئی جابر، ظالم اور انسانیت کی تباہی کے لیے کام کرنے والے وحشی انسانوں کو جنم دیا، وہیں کئی مظلوم قوموں اور انسانوں، پسے ہوئے محنت کشوں اور مزدوروں کے ہمدرد، رہنما اور قائد بھی پیدا کیے، جنہوں نے تمام تعلقات ترک کر کے، زندگی کی آسائشوں اور آرائشوں کو خیر باد کہہ کر میدانِ عمل میں قدم رکھا۔ وہ کمزوروں کے ساتھی اور دکھ سہنے والوں کا سہارا بنے۔

اسی صدی میں لینن، ماؤ، چے گویرا، ہوچی منہ، فیڈل کاسترو اور دیگر عظیم انقلابی انسانوں نے جنم لیا، جنہوں نے مظلوم محنت کشوں اور قوموں کی آزادی، خودمختاری، خوشحالی اور ترقی کے لیے سخت جدوجہد کی۔ ان میں حوصلہ اور ہمت پیدا کی، اپنے حقوق کے لیے لڑنا سکھایا۔ اسی صدی میں ہماری سندھ، ہماری اس سرزمین نے بھی اپنے بطن سے ایسے جری اور بے خوف انسانوں کو جنم دیا، جنہوں نے اپنی ماں کی مانگ میں سندور بھرنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ جنہوں نے سندھ کی حیثیت منوانے اور سندھیوں کو ایک مستقل اور ترقی یافتہ قوم بنانے کے لیے پورے برصغیر کے ذہنوں کو جھنجھوڑا۔ اپنے قومی وقار کی بحالی کے لیے جدوجہد کی۔

اپنی بھٹکی ہوئی قوم کو سچائی اور سائنسی شعور سے آراستہ راہ پر لانے کی کوششیں کیں۔

بیسویں صدی کی سندھ میں ہمیں ایسے کئی نام ملیں گے، جنہیں نہ صرف اپنے بلکہ بیرونی دنیا والوں نے بھی تسلیم کیا اور ان کے جذبے اور کام کی تعریف کی۔ آج بھی ان عظیم شخصیات کے عالمی سیاست میں ادا کیے گئے کردار کو زندہ دل قومیں عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان ہی لوگوں میں قاضی فیض محمد بھی ایک ہیں۔ ان کے تمام کارنامے اور عمل سندھ ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کی "عوامی تاریخ "میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔

قاضی صاحب کی زندگی کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سندھ میں کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے بعد قاضی فیض محمد وہ دوسری شخصیت تھے، جنہوں نے سندھی قوم اور یہاں کے محنت کش عوام کی خوشحالی کے لیے جاری ہر جدوجہد کا ساتھ دیا، اور ایسی سندھ دوست تحریکوں میں قاضی صاحب کا کردار منفرد رہا۔ جب بھی، جہاں بھی سندھ اور یہاں کے محنت کشوں کے مفادات پر ضرب پڑی، یا کسی ناپاک نظر نے اس سرزمین کو دیکھا، تو وہ قاضی صاحب کی تیز دھار تلوار کا نشانہ بنا۔ وہ وقت کے ہر جابر اور ظالم سے ٹکر لیتے اور اس کے سامنے سینہ سپر ہوتے رہے۔ ایسے مردِ مجاہد کی زندگی کا مطالعہ بلا شبہ بہت فائدہ مند ہوگا۔

قاضی صاحب ایک اصول پسند سیاستدان، اعلیٰ دانشور، ماہر تعلیم، ممتاز قانون دان، ترقی پسند ادیب، کلاسیکی موسیقی کے ماہر اور محنت کشوں کے بہترین ساتھی تھے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ نہایت مصروف اور قومی مقصد کے لیے وقف تھا۔ وہ اصولوں پر سودے بازی کو جانتے ہی نہ تھے۔ کسی بات پر سچ کو چھپا کر مصلحت اختیار نہ کرتے، کبھی جاگیردارانہ سیاست کے چکر میں نہ آئے۔ ہمیشہ کمزوروں کے ساتھی اور

محنت کشوں کے محافظ رہے۔ ان کی سیاست انتخابات کے ذریعے ظالم سامراجی مشینری میں شامل ہو کر اس کا پرزہ بننے کی نہیں تھی، بلکہ خون کی بازی تھی، جان کا سودا تھا۔ یہ "سسی نیزے پر رکھو، اچھلو تو آدھی ہو جائے "جیسا معاملہ تھا۔ وہ سیاست کو جاگیردارانہ تفریح یا مشغلہ نہیں بلکہ مکمل سائنس سمجھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سیاست ایک اہم سائنس اور زندگی کا سب سے زیادہ مؤثر عمل ہے۔(1) "

وہ اپنے دور کی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ طرزِ سیاست اور ایسے سیاستدانوں کے سخت دشمن اور مخالف رہے۔ برصغیر میں غلامی کے دور میں جو سیاست وزارتیں حاصل کرنے اور سیاسی تنظیموں کے ذریعے فیصلہ کن جنگ کر کے جدوجہد کے ذریعے آزادی حاصل کرنے کے بجائے سامراج کی چاپلوسی کر کے کچھ رعایتیں اور مفادات حاصل کرنے پر مبنی تھی، اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

"سیاست قوموں کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی زندگی ہے، پتہ نہیں لوگ سیاست کو کیا سمجھتے ہیں، کچھ تو اسے بازیگری تصور کرتے ہیں۔ مگر ان سب روپوں والے لوگ جاہل ہیں، جنہوں نے سیاست کا جنازہ نکال کر انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ حقیقت میں سیاست ایک بہت اعلیٰ سائنس ہے، جو منطقی طور پر انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال ہونی چاہیے۔ مگر افسوس کہ یہاں، خاص طور پر مسلمانوں کے ممالک میں، خود پرستی کے لیے سیاست ایک اوزار بن گئی ہے۔ جس کے ذریعے انہوں نے اپنے لوگوں کو تو تباہ کر ہی دیا، اب تو پوری دنیا کی تباہی کا سبب یہ سیاسی سورما بن رہے ہیں۔(2) "

قاضی فیض محمد شخصیت پرستی اور خود پرستی سے بالاتر رہے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے:

"لوگ کہتے ہیں کہ اپنے نام کو قائم رکھا جائے اور کچھ کر

کے دکھایا جائے۔ مگر ہم ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ سمجھتا ہوں کہ ایسا خیال بھی بڑی نفس پرستی ہے۔(3) "

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"شخصیت پرستی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ عوامی شخصیت کو اجاگر کرنا چاہیے۔ عوام کے ہر فرد کو موتی اور ہیرا بنایا جائے... شخصیت بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ اسے بت بنا کر پوجا شروع کرنا، خود تخلیق کی پوجا کرنا بیماری ہے۔ لوگ ان وسوسوں میں گھٹ کر مر جاتے ہیں۔ ہر شخصیت اپنے وقت اور اس کی جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہے۔(4) "

برطانوی سامراج کے جبر کے دنوں میں وہ کھلے عام انقلابی رنگ و انداز میں غلام قوموں اور پسے ہوئے طبقوں کی حمایت کر کے سیاسی فضا میں ہلچل پیدا کرتے رہے۔ انگریز سامراج کے غصے اور غضب کا ہمیشہ شکار رہے۔ مگر پھر بھی "آہ نہ سنائی عام کو"۔ کسی سے شکایت نہ کی، اور نہ ہی یوں ہی فریاد کی کہ میں نے یہ کیا، وہ کیا، اتنی تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کیں۔ وہ خاموشی سے اپنے فرض کی ادائیگی کرتے رہے۔ ان کی سچائی اور خلوص، بہادری اور بے باکی کے دوست اور دشمن سب معترف رہے۔ کوئی ان کے انقلابی کردار پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔

قاضی صاحب جس پیشے سے وابستہ تھے، وہ پیشہ مال و دولت جمع کرنے، بنگلے اور کوٹھیاں بنانے کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ وکیل اس ملک میں سب سے زیادہ خوشحال، اپنی کاروں والے امیر مانے جاتے ہیں۔ اس ملک میں وکیلوں کی جھونپڑیاں دیکھتے دیکھتے بنگلوں میں بدل گئیں۔ مگر قاضی صاحب کی جگہ اور مال و دولت ترقی نہ کر سکے۔ وہ وکالت صرف پیٹ پالنے کے لیے کرتے تھے، نہ کہ کاروں اور بنگلوں کے حصول کے لیے۔ وہ ہمیشہ سادہ زندگی گزارتے رہے۔

قاضی صاحب نے جو کچھ بھی کمایا، وہ سیاست میں آ کر ملک و قوم کے لیے خرچ کر دیا۔ وہ جیسے پہلے تھے، آخری لمحے تک ویسے ہی رہے۔ جو کچھ بھی وکالت سے کماتے، اس میں سے کچھ پیٹ کی قوت کے لیے نکالتے، باقی کتابیں چھاپنے، پمفلٹ نکال کر تقسیم کرنے، ہاریوں، مزدوروں اور دیگر پارٹی کے سیاسی قیدیوں کے مقدمے لڑنے، ان کی جیل میں مدد کرنے، پارٹی فنڈ میں چندہ دینے، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے پر خرچ کرتے۔ اپنی آخری زندگی کی معاشی حالت کا نقشہ انہوں نے یوں کھینچا ہے:

"میں اس وقت بالکل فقیر ہو چکا ہوں، یعنی جو کچھ ساری عمر میں وکالت کے پیشے سے لاکھوں روپے کی صورت میں کمایا، وہ سب وطن اور وطن کے لوگوں کی بہتری کے لیے سیاست میں آ کر خرچ کر دیا۔ کیونکہ اس ملک میں سچی سیاست کے میدان میں اپنی جان، مال، سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ وقتاً فوقتاً حکومتیں سیاست میں دشمنی کر کے گھر اور زمینیں بھی چھین لیتی ہیں۔ اس وقت میرے پاس 1500 روپے اور گندے کپڑے ہیں۔(5) "

بچپن اور تعلیم

قاضی صاحب نے سندھ کے ضلع نواب شاہ کے ایک چھوٹے مگر اہم تاریخی شہر ہالاڻي میں 23 نومبر 1908ء کو قاضی نبی بخش صدیقی کے گھر جنم لیا۔

قاضی صاحب ابھی چھ ماہ کے ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کے بڑے خاندان میں اموات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند ہی مہینوں میں گھر کے تمام مرد افراد وفات پا گئے۔ گھر میں صرف قاضی صاحب اور چند خواتین ہی باقی رہ گئیں۔

انہوں نے تعلیم کا آغاز اپنے گاؤں کے سرکاری سندھی اسکول میں داخل ہو کر کیا۔ ابھی دس سال کے ہی تھے کہ 1918ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اور 1919ء میں برصغیر میں خلافت اور کانگریس کی تحریکیں زور پکڑ گئیں۔ اس وقت قاضی صاحب ہندو طلبہ اور کانگریسی کارکنوں کی صحبت میں آ کر قومی اسکول میں داخل ہوئے اور اس طرح گیارہ سال کی کم عمری میں ہی قومی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ جب وہ تیسری جماعت میں تھے تو کھدر پہننا، چرخہ کاتنا، صبح سویرے جلوس نکالنا اور قومی ترانے گانا شروع کر دیا۔

قاضی صاحب نے مختلف اسکولوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پہلے ہالاڻي میں، پھر 1922ء میں خیرپور ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد نوشہرو فیروز کے مدرسے میں داخلہ لیا، جہاں سے ان کی سیاسی زندگی کا حقیقی آغاز ہوا اور وہ 1927ء سے عملی سیاست کے میدان میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے ("Quit India"انڈیا چھوڑو) تحریک کے درمیانی مراحل

میں) "Simon Go Back"سائمن کمیشن واپس جاؤ) تحریک میں حصہ لیا۔

1927ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے سر جان سائمن کی قیادت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ ہندوستانی حکومت کے انتظام میں کیا تبدیلیاں کی جائیں، تاکہ آزادی کی ابھرتی ہوئی تحریکیں کچھ وقت کے لیے دب جائیں اور "انڈیا چھوڑو "تحریک کو روکا جا سکے۔ جب یہ کمیشن کراچی آیا تو یہاں کے عوام نے ان کے سامنے بمبئی حکومت سے سندھ کی علیحدگی کا مطالبہ رکھا، مگر کمیشن نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور عوامی مطالبے کو رد کر دیا۔ اس پر سندھ کے سامراج مخالف ترقی پسند افراد نے فیصلہ کیا کہ سائمن کمیشن کے ارکان کی آمد پر سندھ میں مظاہرے کیے جائیں تاکہ انہیں یہ باور کرایا جائے کہ برصغیر کا عوام آئینی اصلاحات یا آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچانے والے کسی بھی اقدام کو برطانوی غلامی میں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس عوامی ردعمل کے باعث سائمن کمیشن ناکامی سے دوچار ہو کر واپس چلا گیا۔

اس وقت قاضی صاحب نوشہرو میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے سندھ کے قومی رہنماؤں کے فیصلے کو مؤثر جواب دیتے ہوئے اپنے ہم عمر ساتھیوں کو اس بات پر متفق کیا۔ اسکول میں تقریریں کیں، ہاتھ سے لکھے پمفلٹ تقسیم کیے، بینر لگائے، کئی دوست تیار کیے اور ان کی قیادت کرتے ہوئے پڈعیدن اسٹیشن پر پہنچے، جہاں سائمن کمیشن کے ارکان ریل گاڑی کے ذریعے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ساتھیوں کے ساتھ "Simon Go Back"کے نعرے لگائے اور ارکان کا سیاہ جھنڈوں سے استقبال کیا۔

قاضی صاحب کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس نوشہرو اسکول میں آئی اور استاد عثمان علی انصاری سے کہا کہ وہ قاضی صاحب کو حوالے کریں۔ مگر ایک شفیق استاد نے یہ گوارا نہ

کیا کہ ان کی موجودگی میں ایک کم عمر طالب علم کو برطانوی حکومت کے ایجنٹ پولیس والے گرفتار کریں۔ چنانچہ انہوں نے قاضی فیض محمد کو کسی طریقے سے اسکول کی حدود سے باہر نکال دیا۔ پولیس نے پورا اسکول چھان مارا مگر ناکام ہو کر واپس چلی گئی۔

قاضی صاحب نے 1929ء میں میٹرک پاس کیا اور سامارو میں کلرک مقرر ہوئے۔ مگر انہیں سرکاری نوکری پسند نہ آئی، چنانچہ انہوں نے والدہ کی مدد سے علی گڑھ میں داخلہ لیا، جو اس وقت برصغیر کی سیاست کا مرکز اور مختلف قومی رہنماؤں کا اجتماع گاہ تھا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور ان کی ذہنی سوچ اور فکر میں مزید پختگی آئی۔ دو سال علی گڑھ میں رہنے کے بعد وہ واپس آ کر کراچی انجینئرنگ کالج میں داخل ہوئے، پھر وہاں سے سائنس کالج میں داخلہ لیا۔ کراچی میں تعلیم کے دوران ان کی ملاقات پنڈت نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ آئی آئی قاضی اور دیگر رہنماؤں سے ہوئی۔ جب ایسے رہنما کراچی آتے تو وہ قاضی صاحب کو اپنے دوروں میں ساتھ رکھتے۔ انہی دنوں میں سبھاش چندر بوس کے جلسوں میں جانے اور ان کی مؤثر تقریریں سننے کا موقع ملا۔ وہ سبھاش بوس سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے جلسوں میں جا کر پولیس کے ڈنڈے اور مار بھی کھائی۔

وہ بچپن سے ہی وطن دوست اور محنت کشوں کے ہمدرد تھے۔ جہاں بھی وطن اور اس کے مظلوم عوام کی آزادی کی چنگاری دکھائی دیتی، وہاں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے۔ ان کے طالب علمی کے دور میں شہید اللہ بخش سومرو نے مذہبی قومی نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے قوموں کی لسانی اور جغرافیائی بنیاد پر آزادی کا نعرہ بلند کیا اور سندھ کو مکمل قومی خودمختاری دلانے کے لیے میدان ہموار کرنے لگے، تو قاضی صاحب ان سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے

حامی بن گئے۔ شہید اللہ بخش مسلم لیگ کو انگریزوں کی کٹھ پتلی جماعت کہتے تھے۔ وہ مذہبی بنیادوں پر حاصل کی گئی آزادی کو حقیقی آزادی نہیں سمجھتے تھے اور اس کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ 1935-36ء کے دوران "خالق دِنی ہال " میں شہید اللہ بخش کی حمایت میں ایک جلسہ ہوا، جس میں علامہ آئی آئی قاضی بھی شریک ہوئے۔ قاضی فیض محمد اور محترم جی ایم سید نے اس جلسے میں بھرپور حصہ لیا۔ جلسے کے منتظمین نے قاضی فیض محمد کو علامہ آئی آئی قاضی کی کرسی کے پیچھے محافظ کے طور پر کھڑا کیا، کیونکہ حکومت کے ایجنٹوں اور مسلم لیگی غنڈوں کے حملے کا خطرہ تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ جلسے کے دوران حکومت کے ایجنٹوں اور مسلم لیگیوں نے جلسے میں مداخلت کر کے اسے درہم برہم کر دیا اور لوگوں کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ قاضی فیض محمد اور دیگر محافظوں کو غنڈوں نے مارا پیٹا اور دھکیل کر جلسہ گاہ سے باہر پھینک دیا۔ جس سے ان کے جسم پر گہرے زخم آئے اور وہ خون میں رنگ گئے۔

قاضی صاحب نے 1935ء میں بمبئی یونیورسٹی سے بی ایس سی (B.Sc) کی ڈگری حاصل کی۔ بی ایس سی کرنے کے بعد مختلف نوکریوں میں لگ گئے۔ 1933ء سے 1940ء تک محکمہ تعلیم میں ملازم رہے۔ اس کے بعد 1940ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایل ایل بی (L.L.B) کی ڈگری حاصل کی اور 1941ء سے باقاعدہ وکالت شروع کی۔ اس طرح قاضی صاحب سندھ ہائی کورٹ کے سینئر وکیل رہے، مرتے دم تک۔

سیاسی زندگی کی شروعات

جب قاضی فیض محمد تعلیم یافتہ اور باشعور ہوئے تو ان کے ذہن میں خیالات کی لہریں اٹھنے لگیں۔ انہوں نے اپنی زمین پر غیر ملکی لٹیروں کو دیکھا، اپنے وطن کی بے عزتی ہوتے دیکھی، مزدوروں کے چہروں پر مایوسی اور ناامیدی دیکھی۔ قوم کے بالادست طبقے کو القابات لیتے دیکھا۔ جاگیرداروں اور پیروں کو اسمبلیوں میں ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالتے اور انگریز سامراج سے وفاداری کے بدلے انعامات لیتے دیکھا۔ غریب دن بہ دن مزید غریب ہوتا گیا، امیر اور بھی امیر ہوتا گیا۔ غریبوں پر ظلم و ستم، محنت کشوں کی لوٹ مار—یہ سب کچھ قاضی صاحب برداشت نہ کر سکے۔

آخر ایک حساس دل رکھنے والا انسان کب تک یہ سب برداشت کرتا؟ کہ عوام بھیڑ بکریوں کی طرح روز جیلوں میں ٹھونسے جائیں، افسران اپنے پیٹ اور بھی پھلائیں، سات سمندر پار کا گورا اپنے فوجی بوٹوں سے جنم کا حق مانگنے والوں کو روندتا رہے، اور دوسرے کے پیسے پر ایک چھوٹے سے جزیرے کو دنیا کا امیر ترین ملک "گریٹ برٹین "بناتا رہے۔ جب قاضی صاحب ان تمام باتوں کی تہہ تک پہنچے تو انہوں نے تمام تعلقات ترک کر دیے، دنیا کے دستور کو ٹھوکر مار کر آزادی کے لیے لڑنے والے دیگر مجاہدوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ وہ طالب علمی کے دور سے ہی سیاست میں داخل ہوئے اور آخری سانس تک مظلوموں کی حمایت اور ظلم کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔

انہیں سیاست میں قدم رکھنے میں وکالت کا بھی بڑا دخل رہا، کیونکہ اس وقت وکیل ہی وہ طبقہ تھا جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ باشعور بھی تھا۔ وکیل قانون کی سمجھ بوجھ رکھنے کے باعث اپنی قوم کا آئینی طریقوں سے بہتر دفاع کر سکتے تھے۔ وہ دنیا کے نشیب و فراز، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب، قومی اور طبقاتی جدوجہد کے رجحانات سے واقف تھے۔ قاضی صاحب بھی اپنی غلامانہ حیثیت ختم کر کے انگریز سامراج کا طوق اپنے گلے سے اتارنے کے لیے ہر وقت کوشاں رہے۔

خاکسار تحریک

قاضی صاحب نے باقاعدہ کسی سیاسی جماعت سے وابستگی 1933ء میں اختیار کی۔ یہ پہلی جماعت تھی—علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک۔ وہ اس تحریک میں 1933ء سے 1945ء تک سرگرم رہے۔ 1936ء میں جب سندھ بمبئی سے الگ ہوا اور خاکسار تحریک نے زور پکڑا، تو سندھ سے قاضی صاحب، عبدالرحیم میمن اور الہداد شجراہ وہ پہلے افراد تھے جو خاکی وردی پہنتے تھے اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ بیلچہ اٹھا کر کراچی شہر میں مارچ پاسٹ کرتے تھے۔

جب وہ خاکسار تحریک میں تھے، تو 1942ء میں بنگال میں شدید قحط پڑا۔ اس وقت علامہ مشرقی نے انہیں اور دیگر کارکنوں کو حکم دیا کہ وہ رضاکار بن کر کلکتہ جائیں۔ قاضی صاحب پارٹی کے حکم پر کلکتہ پہنچے اور وہاں دو ماہ تک متاثرین کی مدد کرتے رہے۔ بنگال سے واپسی پر انہوں نے سندھ کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بنگالی خاندان کے 8 افراد اور 3 یتیم بچوں کو سندھ لے آئے۔ نہ صرف انہیں اپنے خرچ پر رکھا بلکہ چھوٹے بچوں کو تعلیم

بھی دلوائی۔ ان میں سے کچھ نے یہاں تعلیم حاصل کر کے ڈگریاں حاصل کیں اور بنگال واپس چلے گئے۔

سندھ ہاری کمیٹی

یہ وہ دور تھا جب ملک کے رہنما، جو بالادست طبقے سے تعلق رکھتے تھے، سیاست کو اپنے نام و نمود، بیرونی دنیا میں عزت و وقار حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ملک کی بڑی آبادی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور غیر ملکی لٹیروں کے ظلم و جبر کا شکار تھی۔ ہاری اور مزدور اپنے اور پرائے دونوں کے دوہرے ظلم کا شکار تھے۔ سندھ میں ظلم و ستم کا بازار گرم تھا، حکومت اور یہاں کے افسران اندھے گھوڑے پر سوار تھے۔ سندھ میں کوئی ایسی تنظیم یا جماعت نہ تھی جو نچلے طبقے کے حقوق کے لیے آواز بلند کرے، بکھرے ہوئے ہاریوں اور مزدوروں کو یکجا کر کے انہیں اپنے حقوق چھیننے کا شعور دے۔

ایسے ہی تاریک دور میں سندھ کے کچھ باشعور افراد نے 1930ء میں میرپور خاص میں "سندھ ہاری کانفرنس "کا اجلاس بلایا، جس میں "سندھ ہاری کمیٹی "کی بنیاد رکھی گئی۔

سندھ میں مسلم لیگ اور کانگریس کے بعد دوسری بڑی جماعت سندھ ہاری کمیٹی ہی تھی، جو انقلابی بنیادوں پر کام کر رہی تھی۔ قاضی صاحب کو ہاری کمیٹی میں شمولیت کی دعوت 1941ء میں نواب شاہ میں ڈاکٹر ہاسانند، کامریڈ عبدالقادر اور جمال الدین بخاری نے دی۔ چونکہ وہ پہلے ہی ہاری کمیٹی کے کام اور مقصد سے متاثر تھے، اس لیے انہوں نے یہ دعوت خوشی سے قبول کی اور باقاعدہ رکن بن کر کام کرنے لگے۔

قاضی صاحب سندھ کے ہاریوں کو بیدار کرنے اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ اپنی صلاحیتیں استعمال کرنے لگے۔ انہیں اپنے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سندھ ہاری کمیٹی نے ایک میدان فراہم کیا۔ وہ انتہائی سچائی اور خلوص سے ہاریوں اور مزدوروں کی خدمت کرتے رہے۔ اس فرض کی ادائیگی میں انہیں جو جسمانی اور مالی تکالیف پہنچیں، اور بالادست طبقے کے کارندوں کی طرف سے جو اذیتیں دی گئیں، وہ انہیں ہنستے مسکراتے سہتے رہے۔ کبھی ان کا ذکر نہ کیا۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"قربانی کے بغیر نجات حاصل کرنا انتہائی مشکل ہے... اس زمین کو سچی قربانی کی بہت ضرورت ہے۔ منزلِ مقصود کی گاڑی قربانی ہے، قربانی دی جائے تو گاڑی چلتی ہے۔(18) "

انگریزوں کے دور میں قاضی صاحب نے 1945-46ء میں ہاری کمیٹی کی طرف سے "بٹائی تحریک "شروع کی۔ اس کے مطابق ہاری کو زمین کی پیداوار میں سے تین حصے اور زمیندار کو دو حصے ملنے تھے، اور خرچ، بیل، پانی وغیرہ کا حصہ بھی زمیندار کو دینا تھا۔ یہ تحریک قاضی صاحب کی نگرانی میں بڑی کامیاب رہی۔

1945ء میں سندھ اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو ہاری کمیٹی نے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا فیصلہ کیا، اور قاضی صاحب کو کنڈیارو حلقے سے امیدوار بنایا گیا۔ اس دور میں جلسوں کے لحاظ سے ہاری کمیٹی نے کانگریس کے بعد دوسری بڑی کامیابی حاصل کی۔ مگر پھر بھی جاگیرداروں اور حکومت کی ملی بھگت سے ہاری امیدواروں کو شکست دی گئی۔ انہیں پولنگ اسٹیشنوں سے اٹھا دیا گیا، ان کے ووٹروں کو مار کر بھگا دیا گیا۔

قاضی فیض محمد 1941ء کے بعد ساری زندگی ہاری کمیٹی سے وابستہ رہے۔ اس دوران مختلف جماعتوں اور تحریکوں میں

بھی حصہ لیا، مگر اس کے باوجود مسلسل ہاری کمیٹی کے رکن اور سرگرم کارکن رہے۔ ہاری کمیٹی کے پلیٹ فارم پر وہ تقریباً 40 سال کام کرتے رہے، اور کئی تحریکیں اور جدوجہدیں ان کی قیادت میں کامیاب ہوئیں۔ جب وہ خاکسار تحریک میں تھے، تب بھی ہاری کمیٹی کے رکن رہے، اور بعد میں جب مسلم لیگ سے ہوتے ہوئے عوامی لیگ کے پلیٹ فارم سے سندھ کے تحفظ کی جنگ لڑی، تب بھی وہ ہاریوں کے ساتھ رہے۔

مسلم لیگ میں شمولیت

مسلم لیگ، جو کافی عرصے سے برصغیر کی تقسیم کے لیے دو قومی نظریے کی بنیاد پر تحریک چلا رہی تھی، اس کے سیاسی فکر اور نظریے نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ کئی افراد اس طوفان میں بہہ گئے اور ہندو مسلم دو قومی نظریے کی حمایت کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت کی سیاسی فضا پر کانگریس اور مسلم لیگ چھائی ہوئی تھیں۔ بدقسمتی سے دونوں جماعتوں میں خود پرست جاگیردار اور سرمایہ دار ہی سرگرم تھے، جو انگریزوں کے اشارے پر چلتے ہوئے، درست طریقے سے کام کرنے والی کمزور جماعتوں پر حملے کر کے انہیں ختم کر رہے تھے۔

جب قاضی فیض محمد اور ان کے ہم خیال ساتھیوں نے دیکھا کہ لوگ مذہبی جذبات میں بہہ کر مسلم لیگی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، اور انگریز بھی برصغیر کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، تو وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کی قیادت کو جاگیرداروں اور زمینداروں کے خونی پنجوں سے آزاد کرایا جائے، اور نئے بننے والے ملک کی باگ ڈور اس طرح آسانی سے بالادست طبقے کے ہاتھ نہ جانے دی جائے۔ محنت کش دوست رہنما عوام کی رہنمائی کرتے ہوئے نئے ملک کی قیادت سنبھالیں۔ اسی خیال کے تحت قاضی صاحب اور دیگر مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ ان کا یہ منطق کس حد تک درست تھا، اس کا فیصلہ تاریخ ہی بہتر طور پر کر سکتی ہے۔

باقی اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکمل طور پر درست نہ تھے، کیونکہ نئے بننے والے ملک کی خدمت کے لیے صرف مسلم لیگ ہی واحد پلیٹ فارم نہ تھا، دیگر راستے بھی موجود تھے۔

پھر بھی وہ مسلم لیگ کے ایک ایسے گروپ میں شامل ہوئے جو محمد علی جناح کے مسلم لیگ گروپ سے زیادہ ترقی پسند تھا۔ یہ گروپ سوشلسٹ خیالات رکھنے والے اور کمیونسٹ پارٹی کے قریب رہنے والے مولانا حسرت موہانی کا گروپ تھا۔ اس طرح قاضی صاحب 1946ء میں مولانا حسرت موہانی کے گروپ میں شامل ہوئے۔ مولانا نے انہیں سندھ کا رہنما مقرر کیا۔ مولانا اپنے گروپ کے ذریعے پورے ہندوستان کے سوشلسٹوں کو اکٹھا کر رہے تھے تاکہ مسلم لیگ کے دوسرے دھڑے، جس پر جاگیردار اور پیر قابض تھے، کو اقتدار حاصل نہ ہو، اور نہ ہی انہیں ایسا موقع دیا جائے کہ وہ انگریزوں کی مدد سے ہر چیز کے مالک بن جائیں۔ مگر بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ ایسا ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ رجعت پسند قیادت کے تحت رہتے ہوئے کوئی مثبت کام نہیں کیا جا سکتا۔

”سانپ مرے یا دشمن، فرق نہیں“ کے اصول کے تحت برطانوی حکومت سندھ میں آزادی کی جدوجہد کو یہاں کے مسلم لیگی وزیروں کے ذریعے کچلنا چاہتی تھی۔ سندھ کے مسلم لیگی وزیر عہدوں کی لالچ میں آ کر سندھ کے فرزندانِ آزادی کے سینوں میں سنگینیں گھونپ رہے تھے۔ ”حر تحریک“ جو اس وقت برصغیر میں منفرد انداز میں آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کر رہی تھی، اسے تباہ کرنے کے لیے مسلم لیگی وزیروں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مارچ 1942ء میں سندھ اسمبلی سے ”حر ایکٹ“ پاس کرایا گیا، ہزاروں حر اور ان کے ہمدردوں کو جیلوں میں ڈال کر اذیتیں دی گئیں، اور جون 1942ء میں سندھ میں مارشل لا نافذ کیا گیا، جو 12 ماہ تک جاری رہا۔ اسی دور میں مسلم لیگی وزیروں کے سامنے

سندھ کی آزادی کے لیے لڑنے والے رہنما صبغت اللہ شاہ کو 1 مارچ 1943ء کو شہید کر دیا گیا۔

جب 21 جنوری 1946ء کو نئے انتخابات ہوئے، تو اس کے بعد برطانوی گورنر نے سندھ کے ایک جاگیردار سر غلام حسین کو نئی وزارت بنانے کی پیشکش کی۔ سر غلام حسین وزیر اعلیٰ بنے، اور ان کے ساتھ ایوب کھوڑو بھی وزیر بنے۔ ان دونوں نے سندھ دھرتی کے سرفروش حر مجاہدوں کو ختم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایسی صورتحال دیکھ کر قاضی صاحب کا دل کڑھنے لگا۔ انہوں نے اپنے گروپ کے کارکنوں کو اس ظلم کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار کیا۔ مسلم لیگ کونسل نے ان کی قیادت میں کونسلروں کا ایک وفد تشکیل دیا، جس کا کام یہ تھا کہ وہ محمد علی جناح سے ملاقات کر کے ان کی توجہ مسلم لیگی وزیروں کی حرکتوں کی طرف مبذول کرائیں۔ قاضی صاحب کو اس وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

جب پوری سندھ کابینہ جمع ہوئی اور جناح نے اس کی صدارت کی، تو قاضی صاحب اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچے۔ انہوں نے جناح سے وزیروں کے خلاف سخت الفاظ میں بات کی اور ان کا ذمہ دار جناح کو ٹھہرایا۔ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:
"اس وقت میری روش اتنی سخت تھی کہ جیسے آج کل ہوتا ہے، مجھے جیل میں ڈال دیا جاتا، مگر میرے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ کھوڑو صاحب اور دیگر اس پر راضی ہوئے کہ زیادتیوں کا ازالہ کیا جائے گا۔(23) "

انگریزوں کی سازش اور برصغیر کے جاگیرداروں و سرمایہ داروں کی عوام دشمن سازش کے نتیجے میں 1947ء کی مشہور تقسیم ہوئی، جس نے برصغیر کی تمام قوموں کے اتحاد اور بھائی چارے کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس تقسیم سے سندھ کو بھی بہت نقصان ہوا۔ سندھی قوم، سندھی زبان، سندھی ثقافت

گویا ایک گہری کھائی میں جا گری۔ یہاں سے کئی مقامی افراد ہجرت کر کے ہندوستان میں پناہ گزین بنے، اور وہاں سے کئی مہاجر یہاں آ گئے۔

ان دنوں قاضی صاحب پر مسلم قوم پرستی کا جنون طاری تھا، جس کا اظہار انہوں نے خود کیا:
”خیر، ہم بہت جذباتی لوگ تھے۔ قاضی صاحب (آئی آئی قاضی) بھی کہتے تھے کہ پاکستان کے بننے سے اندیشہ ہے کہ لوگ دربدر ہوں گے... مگر ہمیں لیگ کا ایسا نشہ چڑھ گیا کہ اس بات کی طرف توجہ ہی نہ دی۔(24) “

تقسیم کے بعد جب سندھ میں ہندوؤں کی ہجرت اور قتل و غارت دیکھی، تو ان کا دل بھر آیا۔ انہوں نے ہندوؤں کو ہجرت سے روکنے کی تحریک شروع کی۔ وہ ہندوؤں سے اپیلیں کرتے رہے کہ سندھ نہ چھوڑیں، اور انہیں ہر طرح کی مدد اور سہولتیں فراہم کیں۔ ہندو مسلم مشترکہ جلسے کیے، گاندھی کو آنے کے لیے تار بھیجے۔ اس تحریک سے مفاد پرست مسلم جاگیردار اور سرمایہ دار سخت ناراض ہوئے، اور حکومت نے قاضی صاحب کو دھمکیاں دیں کہ تحریک بند کرو ورنہ جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس کے باوجود وہ سندھ کے دورے پر نکلے اور ہندوؤں سے تقریروں میں کہنے لگے:
”بابا، یہ ملک آپ کا اور ہمارا مشترکہ ہے۔ سندھ ہم سب کی ہے، آپ اپنا وطن نہ چھوڑیں۔(25) “

جب حالات خراب ہونے کی وجہ سے سندھی ہندو ہندوستان چلے گئے، تو ان کی زمینیں، جن کے اصل وارث یہاں کے سندھی ہاری تھے، حکومت نے باہر سے آنے والوں کو جعلی کلیموں کے ذریعے دینا شروع کر دیں۔ حکومت نے ایسے قوانین بھی پاس کیے، جن کے تحت جن مہاجرین کے پاس ہندوستان میں کچھ نہ تھا، انہوں نے جعلی کلیم لکھوا کر کئی جائیدادیں اور زمینیں حاصل کرنا شروع کر دیں۔

حکومت کی سیٹلمنٹ پالیسی میں یہ شق شامل کی گئی کہ ہر وہ گھر جس کی قیمت 10 ہزار روپے سے زیادہ ہو، وہ کسی مقامی فرد کو نہیں دیا جائے گا۔ دکانوں کے بارے میں بھی یہی شق رکھی گئی کہ کوئی دکان کسی مقامی فرد کو نہیں دی جائے گی۔ 1949ء میں سندھ اسمبلی میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ سندھ میں مسلمانوں کی وہ زمینیں جو ہندوؤں کے پاس گروی رکھی گئی تھیں، وہ اصل مالکان (سندھی مسلمان) کو واپس دی جائیں۔ یہ قرارداد منظور ہوئی، مگر گورنر جنرل نے اس پر دستخط نہ کیے، جس کی وجہ سے یہ قانون نافذ نہ ہو سکا۔ حالانکہ پنجاب میں یہی قانون نافذ ہوا اور اس پر مکمل عمل بھی ہوا، اور گروی رکھی گئی زمینیں مالکان کو واپس مل گئیں۔ (26)

جب سندھی ہندوؤں کی زمینوں پر جاگیردار، زمیندار اور باہر سے آئے افراد نے قبضہ کرنا شروع کیا اور مقامی ہاریوں کو بےدخل کرنے لگے، تو قاضی فیض محمد نے ان زمینوں کو ہاریوں کو دلوانے کے لیے ایک تحریک شروع کی، جو آگے چل کر "الاٹی تحریک "کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم آدھی زمین مقامی ہاریوں کو دی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ زمینداروں اور نوآبادکاروں کو خطرہ محسوس ہوا کہ اس تحریک سے ان کے مفادات خاک میں مل جائیں گے۔ چنانچہ رجعت پسند طبقوں نے حکومت سے سازباز کر کے وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو پر دباؤ ڈالا، اور قاضی صاحب کو دفعہ 107 کے تحت مقدمہ قائم کر کے قید کروا دیا۔

ہندوؤں کی زمینیں سندھی ہاریوں کو دلوانے والی اس تحریک کو بھی جاگیرداروں نے نقصان پہنچایا۔ ضلع نواب شاہ میں وہاں کے ڈپٹی کمشنر مسعود خدر پوش نے ہاری تحریک کو غلط رخ دے دیا، اور ہاریوں کو ہندوؤں کی زمینوں پر زبردستی قبضہ کروانا شروع کر دیا۔ اس دور کا ایک افسوسناک واقعہ یہ ہوا کہ ہاری کارکنوں نے ایک ایسے ہندو کی زمین پر قبضہ کر لیا، جو سندھ اسمبلی میں ہاریوں کی

نمائندگی کرتا تھا۔ (27) اس سے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ تحریک ہندو مسلم نفرت میں نہ بدل جائے۔ چنانچہ یہ تحریک جلد ہی ناکام ہو گئی۔

تحریک کے اس غلط رخ نے قاضی صاحب کو بہت رنج پہنچایا۔ جب وہ مفاد پرستوں کی اس چال سے واقف ہوئے، تو انہوں نے ہاری کمیٹی کے کارکنوں پر سخت نظر رکھنی شروع کی اور کچھ افراد کو ہاری کمیٹی سے نکال دیا۔

کراچی کی علیحدگی

سندھ کے مسلم لیگی جاگیردار اور غیر مقامی عناصر ہمیشہ اس سوچ کے حامل رہے ہیں کہ سندھ کے محنت کشوں کے اتحاد کو ختم کرنے کے لیے سندھ کی قومی حیثیت کو مٹایا جائے، سندھی قوم کو اقلیت میں تبدیل کیا جائے، اور یوں اپنے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ ان کی لالچی نگاہوں کا پہلا شکار سندھ کا خوشحال اور واحد بندرگاہ "کراچی "بنی، جہاں سے کروڑوں روپے کی آمدنی ہوتی تھی۔ اس آمدنی پر قبضہ کرنے کے لیے انہوں نے ہاتھ پاؤں مارے اور کراچی کو سندھ سے الگ کروا دیا۔ یہ سندھ کو توڑنے کی طرف پہلا قدم تھا۔

1948ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے کراچی کو سندھ سے جدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مرکزی حکومت کی اس سندھ دشمن چال کی مخالفت تمام طبقوں اور نظریات کے افراد نے کی۔ اس فیصلے کے خلاف سندھ مسلم لیگ کونسل نے قرارداد منظور کی اور وزیروں کو ہدایت دی کہ وہ کراچی کے معاملے پر سخت مؤقف اپنائیں، اور اگر ضرورت پڑے تو وزارتوں سے استعفیٰ دے کر دوبارہ انتخابات لڑیں۔ سندھ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے بھی کراچی کی علیحدگی کے فیصلے کی مخالفت کی۔ (28)

سندھ کے محب وطن کارکنوں نے غیر مقامی آبادکاروں کی اس سازش کی مذمت کرتے ہوئے عملی میدان میں قدم رکھا۔ مرکزی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ یہ حکم واپس لے، کراچی کو دوبارہ سندھ میں شامل کرے، اور بڑھتی ہوئی بے چینی کو ختم کرے۔ اس تحریک میں دیگر رہنماؤں کے ساتھ قاضی فیض محمد نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ قاضی صاحب نے اس وقت کے

وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو کو اس سازش سے آگاہ کیا اور اس کی حمایت حاصل کی۔ سندھ اسمبلی کے ارکان اور وزیروں کو اس تقسیم کے خلاف اُبھارا اور ایک بل منظور کروایا۔ (29) عوام کو اس سازش سے آگاہ کرنے کے لیے سندھ بھر میں نکلے، تقریروں اور تحریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔

قاضی صاحب کی بحث و مباحثے کا ایوب کھوڑو پر اتنا اثر ہوا کہ وہ، باوجود اس کے کہ وہ صوبہ سندھ کے وزیر اعلیٰ اور مسلم لیگ سندھ کے صدر تھے، اپنے وزیروں سمیت کراچی کو مرکز کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ مرکز نے سندھ کے گورنر سر غلام حسین کی مدد سے میر غلام علی اور پیر الٰہی بخش کو کھوڑو کی مخالفت پر اُکسایا، اور سندھ میں ارکان اسمبلی کو راضی کرنے اور مخالفت سے باز رکھنے کے لیے بھیجا۔ مگر وہ اکثریت حاصل نہ کر سکے۔ (30)

مرکز نے سر غلام حسین کو حکم دیا کہ کھوڑو کی وزارت کو برطرف کیا جائے اور اس کی جگہ پیر الٰہی بخش کو وزیر اعلیٰ مقرر کیا جائے۔ چنانچہ اپریل 1948ء میں کھوڑو کو وزارتِ اعلیٰ سے ہٹا کر اس پر "سندھ اسپیشل کونسل "کے آرڈیننس نمبر 2 کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ (31)

پیر الٰہی بخش نے وزیر اعلیٰ بنتے ہی سندھ اسمبلی کی منظوری کے بغیر کراچی کو مرکز کے حوالے کر دیا، (32) اور عارضی طور پر سندھ دشمن عناصر اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے۔

کراچی کی علیحدگی کی قاضی صاحب نے سخت مخالفت شروع کی۔ جس کے نتیجے میں پیر الٰہی بخش نے وزارتِ اعلیٰ سنبھالتے ہی قاضی صاحب اور ان کے چار عزیزوں پر ڈکیتی کا مقدمہ درج کروا کر انہیں جیل بھجوا دیا۔

جب قاضی صاحب جیل سے رہا ہوئے تو دوبارہ اپنے کام میں لگ گئے۔ جاگیرداروں اور غیر مقامی عناصر نے اپنی راہ سے یہ رکاوٹ ہٹانے اور ملک کو آرام سے لوٹنے کے لیے قاضی صاحب کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 1948ء کے آخری مہینوں میں ان کے گھر پر ڈاکو بھیجے گئے، جنہیں حکم دیا گیا کہ ڈکیتی کے بہانے جا کر قاضی فیض محمد کو قتل کر دیں۔

ایک رات ڈاکو قاضی صاحب کے گھر میں گھس آئے، مگر اتفاقاً قاضی صاحب بچ گئے۔ ڈاکوؤں نے گھر میں لوٹ مار کی، زیورات لے گئے، قاضی صاحب کی والدہ کو لاٹھیوں سے مارا، ان کی بھاوج کو اتنا مارا کہ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا، اور ان کی اہلیہ کو بھی شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہ واقعہ ان دنوں پیش آیا جب قاضی صاحب ابھی مسلم لیگ کی سینٹرل کمیٹی کے رکن تھے۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں:
"میرا جرم صرف یہ تھا کہ میں چاہتا تھا کہ ہندوؤں کی چھوڑی گئی زمینیں سندھی ہاریوں کو ملیں۔(33) "

مسلم لیگ سے علیحدگی

مرکزی حکومت کی ایسی چالاکیوں اور مسلم لیگ کے وڈیروں کی ایسی سندھ دشمن سازشوں سے قاضی صاحب سخت بیزار ہوئے اور انہوں نے مسلم لیگ چھوڑ کر کسی دوسرے پلیٹ فارم سے کام کرنے کا سوچنا شروع کیا۔

قاضی صاحب نے مسلم لیگ اس وقت مکمل طور پر چھوڑ دی، جب 1950ء کے آس پاس پیر الٰہی بخش کی خالی ہوئی نشست پر ضمنی انتخاب ہونے والا تھا۔ اور صوبہ سندھ مسلم لیگ کے صدر کھڑي نے اپنے سالے عبدالطیف پنھور کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کے لیے مخالفت میں کھڑے امیدواروں کامریڈ جتوئی، شفیع محمد آخوند اور دیگر کو غیر قانونی طریقے سے فارم بھرنے کی اجازت نہ دی۔ (34(
وہ لیگ کے بارے میں لکھتے ہیں" :جلد سندھ کے ظالم وزیروں کی گندی حرکتوں کی وجہ سے لیگ چھوڑنی پڑی اور جیلوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑے۔(35) "

مسلم لیگ سے ان کا نکلنا اس بات کا واضح اعلان تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر مسلم لیگ کے قومی تصور سے متفق نہیں تھے اور وہ ایمانداری سے جانتے تھے کہ مسلم لیگ کا یہ فلسفہ اور خیال، سازشیں اور مکاری، چالاکیاں اور چالبازیاں سندھ دیش کو آگے چل کر تباہی اور بربادی کی گہری کھائی میں دھکیل دیں گی، جہاں ہم تمام سندھیوں کو ہاتھ ملنے پڑیں گے۔ قاضی صاحب کے سابقہ خیالات اور نظریات میں بڑی تبدیلی آئی اور انہوں نے اپنے ماضی میں کیے گئے کام پر سخت پچھتاوا کیا۔ وہ اپنے نظریات اور خیالات میں تبدیلی کے بعد لکھتے ہیں:

"ہم نے نہ تو کسی پروگرام کے لیے، نہ ایسی قیادت کے تحت اور نہ ایسی قربانی کے ساتھ آزادی حاصل کی، جیسے دنیا کے دوسرے ممالک نے آزادی حاصل کی۔ کیونکہ ان کے پاس مخصوص پروگرام تھا، جسے وہ نافذ کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا یہ کہ قیادت سچی اور آگ سے نکلی ہوئی تھی، اور تیسرا یہ کہ انہوں نے بڑی قربانیوں سے یعنی خون دے کر آزادی حاصل کی۔ لیکن یہاں اس کے برعکس بات تھی۔ یہاں شروعات تعصب سے کی گئی اور انگریزوں نے اپنی نقطہ نظر سے ہمیں اتنا گمراہ رکھا، کہ نام کی خاطر آزادی ہمارے گلے سے ظاہری انگریزوں کی غلامی کی زنجیر کاٹ کر ایسی کھائی میں پھینک دیا، کہ آج تک ہم جلتے اور پگّتے رہتے ہیں۔(36) "

لیگ چھوڑنے کے بعد قاضی صاحب کے سیاسی نظریات میں بڑا انقلاب آیا۔ پہلے وہ مسلم قوم پرستی کے حامی تھے، لیکن بعد میں جدید نظریہ قوم پرستی کے حامی بن گئے۔ یہاں جب ہندو مسلم دو قومی نظریہ پر اردودانوں نے یہ تاثر دینا شروع کیا کہ سندھ، بنگال، سرحد، بلوچستان اور پنجاب کی زمین مسلم قوم پرستی اور مسلم ملک کی بنیاد پر ہندوستان سے آئے مہاجروں کی ملکیت ہے اور اردو اس ملک کی واحد قومی زبان ہے، جسے دوسری زبانوں کو ختم کر کے قائم و دائم رکھنا ہے، قاضی صاحب نے اردودانوں کے اس نظریہ کی سخت مخالفت کی اور انہوں نے اردودانوں کے ان دعووں کو جھوٹ، فریب اور دھوکہ قرار دیا۔ (37(

وہ اپنے مضمون میں پاکستان کی تشکیل اور تقسیم کے بارے میں تفصیل سے لکھتے ہیں:
"جناح کے 14 نکات کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے حقوق مانگے گئے تھے، نہ کہ علیحدہ وطن۔ جنہیں ہندوؤں نے قبول نہیں کیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی کی صدارت میں ہندو مسلم مشترکہ صلح کانفرنس ہوئی، مگر جدائی کی کوئی بات نہیں تھی۔ صرف مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔

آخر 1932ء میں سندھ مسلم لیگ کانفرنس ہوئی، جہاں پاکستان کا تصور پیش کیا گیا اور پھر لاہور میں ایسا قرارداد منظور کیا گیا۔ کہیں بھی، کسی بھی جگہ، کسی بھی کاغذ پر ایسا ذکر نہیں ہے اور نہ تھا کہ ہندوؤں، سکھوں کو پنجاب، بنگال، سندھ اور دیگر صوبوں سے نکال کر ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان میں آباد کیا جائے۔ ہے کوئی خدا کا بندہ! جو ان اردو اخبار والوں کو سمجھائے کہ پاکستان، ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا گھر نہیں ہے...... اگر پاکستان صرف مسلمانوں کا گھر تھا تو تقسیم سے پہلے یہ ہجرت کیوں نہ کرائی گئی۔(38) "

یہ تھا قاضی صاحب کا پاکستان کے بارے میں بعد کا تصور، یہ تھا ان کا نظریہ اور یہ تھا ان کے پروگرام کا نقطہ نظر۔ پھر وہ اسی نقطہ نظر سے آگے بڑھ کر کام کرنے لگے۔

ہاری کمیٹی اور اس کے بعد

مسلم لیگ چھوڑنے کے بعد، قاضی فیض محمد کے سامنے سندھ ہاری کمیٹی ہی ایسا پلیٹ فارم تھا، جہاں سے وہ اپنے نظریات کی تبلیغ کر سکتے تھے، اپنے آدرشوں کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ وہ ہاری کمیٹی میں کافی عرصے سے کام کر رہے تھے۔ جب وہ دوبارہ ہاری کمیٹی میں سرگرم ہو کر کام کرنے لگے تو کمیٹی کے کارکنوں نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں 1951ء میں ہاری کمیٹی کا صدر منتخب کیا۔ وہ اس عہدے پر 1953ء تک دو سال کام کرتے رہے۔ (39) اس عرصے میں انہوں نے کسانوں کی بھلائی اور بہتری کے لیے کئی کام انجام دیے۔

ہاری کمیٹی میں رہتے ہوئے انہیں سندھ کے وزیرِ اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو نے 1951ء میں قید کروایا اور انہیں کنڈیاری تعلقے کی لاک اپ میں بند رکھا۔ (40) تاکہ وہ کسانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد سے باز رہیں۔ اپنی صدارت کے دور میں انہوں نے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینیں، جن پر زمیندار اور غیر مقامی افراد قبضہ کر رہے تھے، وہ کسانوں کو الاٹ کروائیں۔ سندھ ہاری کمیٹی کی طرف سے بے زمین کسانوں کو زمین دلوانے کے لیے کوششیں تیز کیں۔ جب ہاری کمیٹی کی طرف سے آدھی بٹائی کی تحریک شروع ہوئی تو اسے کامیاب بنانے میں دیگر افراد کے ساتھ قاضی صاحب کا بھی بڑا کردار تھا۔ اس کے علاوہ 'ٹیننسی ایکٹ' کے قانون کو پاس کروانے کے عمل میں کامریڈ جتوئی کے ساتھ قاضی صاحب نے بھرپور ساتھ دیا۔

قاضی صاحب نے اس دور میں سانگھڑ اور نواب شاہ ضلع میں 'ہاری حقدار تحریک' شروع کی۔ کسانوں کو درست، صاف بٹائی اور دیگر زراعت کے حقوق دلائے۔ جب وہ ہاری کمیٹی کے صدر تھے تو 'سندھ ایگری کلچرل کمیشن' تشکیل دیا گیا۔ اس کی سب کمیٹی میں قاضی صاحب کے ساتھ جی ایم سید اور میران محمد شاہ کو بطور رکن منتخب کیا گیا۔

اس سب کمیٹی پر یہ کام رکھا گیا کہ وہ سندھ کے خانہ بدوش قبائل، کسانوں، مزدوروں، مہاجرین اور دیگر بے گھر افراد کی مستقل آبادکاری کے لیے اور انہیں ہمیشہ کے لیے مستقل دیہاتوں میں بسانے کے لیے بل تیار کرے۔

جب قاضی صاحب ہاری کمیٹی میں تھے تو ان کے اختلافات کامریڈ حیدر بخش جتوئی سے بھی ہو گئے تھے، جو مذہبی نوعیت کے تھے۔ قاضی صاحب چونکہ مذہبی رجحان رکھنے والے شخص تھے اور مکمل سوشلسٹ خیالات کے حامل نہیں تھے، اس لیے مزدوروں کے لیے کام کرتے ہوئے ان سے انجانے میں کئی غلطیاں بھی ہوئیں۔ ان کی سوچ اور فکر پر علامہ آئی آئی قاضی کے فلسفے کا بڑا اثر تھا۔ اسی اثر کی وجہ سے وہ مزدوروں کے حامی اور مددگار تو تھے، مگر ان کی مکمل نجات کے لیے مارکسی-لیننی نقطہ نظر والا سائنسی راستہ اختیار نہ کر سکے۔ علامہ صاحب کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے وہ ذہنی الجھنوں کا شکار رہے۔ ان الجھنوں نے ہاری کمیٹی میں بھی ان کے کام پر اثر ڈالا۔ (41)

انہوں نے کچھ وقت کے لیے کامریڈ حیدر بخش جتوئی سے اختلاف کر کے علاءالدین سمی کے ساتھ مل کر 'اسلامی ہاری کمیٹی' بنائی۔ مگر جلد ہی انہیں سمجھ آ گئی اور اسلامی ہاری کمیٹی کے پہلو واضح ہونے لگے۔ انہوں نے اپنی غلطی کا ازالہ کرتے ہوئے دوبارہ کامریڈ جتوئی کے ساتھ شامل ہو گئے۔

(42) اس کے بعد کبھی بھی کامریڈ سے اختلاف نہ کیا اور نہ ہی کوئی شخص انہیں اس حکمت عملی سے ہٹا سکا۔

آل پاکستان عوامی جماعت:
جب قاضی صاحب ہاری کمیٹی میں تھے تو اس وقت عوامی جماعت مرکزی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہی تھی اور حکمران پارٹی کی مخالفت میں وطن کی خوشحالی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ جب قاضی صاحب نے دیکھا کہ یہ جماعت جدید قومی نظریے کی حامل ہے اور صوبوں کو صوبائی خودمختاری دلوانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، اور دوسرا یہ کہ اس پارٹی کا اقتصادی و معاشی پروگرام مزدوروں کی بھلائی پر مبنی ہے، تو وہ اس تنظیم میں شامل ہو گئے تاکہ تمام صوبوں کے ترقی پسند افراد مل کر ملک میں وڈیرہ شاہی اور جاگیردار طبقے کا تختہ الٹ کر ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم کر سکیں۔

قاضی صاحب نے بطور رکن عوامی جماعت میں اچھا کام کیا اور اپنے علاقے میں عوامی جماعت کو خاصی مقبولیت دلائی۔ مگر جلد ہی حکومت نے عوامی جماعت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو نقصان پہنچانے اور ترقی پسندوں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے عوامی جماعت کے لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا۔

ان دنوں میں میاں افتخار الدین نے 'آزاد پاکستان پارٹی' بنائی۔ میاں افتخار تمام قوم پرست کارکنوں کو اس پارٹی میں شامل کرنے کی کوشش میں تھے، تو دیگر کارکنوں کے ساتھ قاضی فیض محمد بھی میاں افتخار کی پارٹی میں شامل ہو کر کام کرنے لگے۔ (43) کیونکہ اس وقت عوامی جماعت کا کام مکمل طور پر بند ہو چکا تھا اور حکومت عوامی جماعت کے کارکنوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔

سندھ عوامی محاذ:
جب اپریل 1953ء میں تیسری لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے تو 17 مارچ 1953ء کو چند کارکنوں نے حکمران پارٹی مسلم لیگ کی مخالفت میں ایک مشترکہ پروگرام کی بنیاد پر سندھ کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر 'سندھ عوامی محاذ' قائم کر کے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس محاذ کے قیام کا مقصد سندھ اور پاکستان میں جمہوری حکومت کے قیام کے لیے کوشش کرنا تھا۔ (44) چھوٹے صوبوں کو صوبائی خودمختاری دلوانے کی کوشش کرنا تھی۔ یہ نکات قاضی صاحب کے بنیادی اصولوں اور سیاسی پالیسی کے ساتھ ساتھ سندھ ہاری کمیٹی کے پروگرام سے بھی مطابقت رکھتے تھے۔ اس لیے قاضی صاحب نے اپنی پارٹی سندھ ہاری کمیٹی کے ساتھ اس متحدہ محاذ میں شمولیت اختیار کی۔ اس محاذ میں عوامی جماعت، آزاد پاکستان پارٹی اور عوامی لیگ کی سندھ شاخوں نے بھی شمولیت اختیار کی اور مل کر انتخابات میں امیدوار کھڑے کیے۔ (45)

قاضی فیض محمد اس محاذ میں سرگرم کارکنوں کی طرح کام کرتے رہے اور محاذ کے پروگرام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوششیں کرنے لگے۔ تمام مخلص کارکنوں کی محنت سے عوامی محاذ کے ٹکٹ پر 7 ممبر منتخب ہو کر سندھ اسمبلی میں مخالف بینچوں پر بیٹھے۔ (46) ان ممبروں نے سندھ اسمبلی میں بیٹھ کر سندھ کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی اور مخالفین کو سندھ کے حقوق کے حصول کے لیے متحرک کیا۔ ان ممبروں نے سندھ کے حقوق کی حفاظت، کراچی کی واپسی اور دیگر اہم مسائل کے لیے سندھ اسمبلی میں قراردادیں منظور کروائیں۔

عوامی محاذ کنونشن:
انتخابات کے بعد قاضی صاحب نے عوامی محاذ کا پہلا کنونشن نواب شاہ میں طلب کیا۔ اس میں محاذ کا دستور مرتب کیا گیا

اور محاذ کو جماعتی شکل دی گئی۔ اس کنونشن میں شیخ عبدالمجید سندھی کو محاذ کا صدر اور قاضی صاحب کو سیکریٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ (47) یہ کنونشن 26–27 اکتوبر 1953ء کو نواب شاہ میں منعقد ہوا اور قاضی صاحب کو کنونشن کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔

اس کانفرنس کے انعقاد کا اصل مقصد سندھ کو آئینی حقوق دلوانا اور سندھ صوبے کی خودمختاری بحال کروانا تھا۔ اس کنونشن میں پورے ملک سے بڑے بڑے لیڈر اور کارکن شریک ہوئے۔ سندھ اور پاکستان کے مسائل پر کھلے دل سے گفتگو کی گئی اور کئی قراردادیں منظور کی گئیں۔ (48) یہ کنونشن منعقد کرنا، اس کا مکمل انتظام سنبھالنا اور اسے ملکی سطح پر کامیاب بنانا قاضی صاحب کا بڑا کارنامہ تھا۔

ون یونٹ توڑ تحریک

پاکستان کی حکمران جماعت ہمیشہ سے اپنے طبقاتی مفادات کو بچانے اور عوامی احتجاج کو روکنے کے لیے ملک پر بدترین قسم کی آمریت مسلط کرتی آئی ہے۔ خاص طور پر چھوٹے صوبوں کے مظلوم اور پسماندہ مگر ذہنی طور پر ترقی یافتہ عوام کی بیداری، ان کے اتحاد اور اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد رجعت پسند طبقے کے لیے ناقابلِ برداشت بن گئی ہے۔ اسی لیے رجعت پسند طبقات اور ان کے حلیف بڑے صوبے اور ایک مخصوص اقلیت کے مفادات کو محفوظ رکھنے اور چھوٹے صوبوں کا کھلے عام استحصال کرنے کے لیے قانونی جواز تلاش کرتے رہے ہیں۔

انہوں نے چھوٹے صوبوں کے استحصال کو مزید ہمہ گیر بنانے کے لیے ضروری سمجھا کہ صوبوں کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر، ان کی معیشت پر کنٹرول حاصل کر کے، ملک میں انتظامی طور پر مضبوط مرکز قائم کیا جائے اور طاقت کے زور پر چھوٹی قوموں کو اپنی نوآبادیات سمجھ کر وہاں بدترین قسم کی آمریت مسلط کی جائے، تاکہ چھوٹے صوبوں اور خاص طور پر مشرقی پاکستان میں عوامی احتجاج نہ پنپ سکے۔ اسی مقصد کے لیے حکمران جماعت نے 1954ء میں مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ملا کر ون یونٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس سے حکمران جماعت کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ مغربی پاکستان کے تمام صوبے مرکزی انتظامیہ کے کنٹرول میں آ گئے اور انہیں دبانا اور لوٹنا آسان ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ مغربی اور مشرقی

پاکستان کو یکساں یونٹوں میں تقسیم کر کے مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کو ختم کرنے اور وہاں کی جمہوری و عوامی تحریک کو کچلنے کا جواز پیدا کیا گیا۔ حکمران جماعت نے ون یونٹ قائم کر کے چھوٹے صوبوں کی الگ قومی شناخت، سیاسی و اقتصادی مفادات ختم کر دیے اور مسلم قوم کے نام پر انہیں بڑے صوبے اور باہر سے آئے افراد کے استحصال کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔

خاص طور پر سندھ کی قومی حیثیت ختم کر کے وہاں باہر کے لوگوں کو آباد کیا گیا تاکہ سندھیوں کو اقلیت میں تبدیل کیا جا سکے۔ سندھ کی بیراجوں کی زمینیں، یہاں کی نوکریاں، کارخانے اپنے قبضے میں لے کر ان پر غیر مقامی افراد کو مسلط کیا جانے لگا۔

چھوٹے صوبوں اور خاص طور پر سندھ کے عوام نے اس ظلم کے خلاف فریادیں کیں، چیخ و پکار کی، مگر کسی نے کچھ نہ سنا۔ سندھ کو دنیا کے نقشے سے مٹا دیا گیا۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ پیرزادہ عبدالستار نے ون یونٹ کے بل کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے اسے سندھ پر ظلم اور جبر قرار دیا۔ مرکزی حکومت نے خود آئین ساز اسمبلی کو ختم کر کے، وزیرِ اعلیٰ کی اسمبلی میں اکثریت ہونے کے باوجود ان کی حکومت اور وزارت کو زبردستی ختم کر دیا۔ (49(

ون یونٹ مخالف اسپیکر میر غلام علی تالپور کو گرفتار کر کے تھرپارکر کے شہر مٹھی میں قید کر دیا گیا۔ (50(

پیرزادہ عبدالستار کی جگہ سندھ کے ایک جاگیردار محمد ایوب کھوڑو کو وزیرِ اعلیٰ بنا کر ون یونٹ کا بل 11 دسمبر 1954ء کو زبردستی پاس کروایا گیا۔ (51)

ون یونٹ کے خلاف پورے ملک میں تحریک شروع ہوئی۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں احتجاجی جلوس نکلے، مذمتیں ہوئیں، ایکشن کمیٹیاں بنیں۔ قاضی فیض محمد نے 1954ء سے ون یونٹ کے خلاف جاری تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ اس وقت وزیرِ اعلیٰ کھڑو ون یونٹ کے مخالفین کو سختی سے دبا اور کچل رہا تھا۔ پولیس کا تشدد، غنڈوں کے حملے، اذیت رسانی، قید و بند کی تکالیف نے اچھے بھلے لوگوں کو بے بس کر دیا تھا۔ کوئی بھی آواز بلند کرنے کو تیار نہ تھا۔

اس وقت قاضی صاحب، جی ایم سید، شیخ سندھی اور کامریڈ جتوئی نے ون یونٹ کے خلاف تحریک چلانا شروع کی۔ جی ایم سید اور قاضی صاحب نے ون یونٹ کے خلاف عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے پورے سندھ کے دورے کا پروگرام بنایا۔ مگر حکومت کو خبر لگتے ہی جی ایم سید کو ان کے بنگلے سے گرفتار کر لیا گیا۔ قاضی صاحب پھر بھی مایوس نہ ہوئے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق کام جاری رکھتے ہوئے پہلا جلسہ کراچی میں کیا۔ اس کے بعد وہ جیپ میں سوار ہو کر پورے سندھ میں ون یونٹ کے خلاف پرچار کرنے لگے۔

قاضی صاحب نے ون یونٹ کے خلاف کراچی، ٹھٹھہ، کوٹری، حیدرآباد، نواب شاہ، دادو، قمبر، رتودیرو اور لاڑکانہ کا دورہ کیا۔ ان کے جلسوں میں ہزاروں افراد شریک ہونے لگے۔ جن کا جوش و جذبہ، ہمت اور ولولہ دیکھ کر حکومت کے ہوش اڑ گئے۔ قاضی صاحب کی تحریک نے سندھ دشمنوں کو پریشان کر دیا۔ جب وہ لاڑکانہ پہنچے تو لاڑکانہ، جو ایوب کھڑي کا شہر تھا، وہاں بھی ان کا جلسہ کامیاب رہا۔ ہزاروں افراد جمع ہو گئے۔ ون یونٹ کے خلاف فلک شگاف نعرے لگتے رہے۔ ان کی جذباتی تقریر نے ون یونٹ کے جبر کے قلعوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ حکومت کی مشینری لرز گئی۔

حکومت نے وہیں قاضی صاحب کے دورے کو ختم کرنے اور انہیں گرفتار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وزیرِ اعلیٰ کھڑي نے لاڑکانہ کے کلکٹر انور عادل کو براہِ راست حکم دیا کہ قاضی صاحب کو گرفتار کیا جائے۔ کلکٹر نے رات 11 بجے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت انہیں قید کر لیا۔ (52)

قاضی صاحب کو رات کے وقت گرفتار کر کے لاڑکانہ سے سکھر لے جایا جا رہا تھا۔ پولیس نے سندھ کے اس عظیم سپوت کو اذیت دے کر جھکانے کے لیے سردی کے سخت موسم میں ٹرک کے اوپر کھلی ہوا میں سفر کروایا۔ سفر کے دوران ایک درخت کی شاخ ان کے سر سے ٹکرا گئی، جس سے ان کے سر میں گہرا زخم آیا اور وہ خون بہاتے ہوئے سینٹرل جیل پہنچے۔ (53)

جب قاضی صاحب قید میں تھے تو اس دوران سینیٹ کے ممبروں کا انتخاب ہوا، اور وہ جیل میں ہوتے ہوئے بھی اس کے ممبر منتخب ہو گئے۔ قاضی فیض محمد نے اپنی گرفتاری کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ دائر کی۔ پھر انہیں ہائی کورٹ کے حکم پر رہا کر دیا گیا۔ جیل سے آزاد ہو کر آئے تو وکالت کا پیشہ ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ تین ماہ کے لیے سندھ سے باہر انگلینڈ، جرمنی، فرانس، اٹلی، یونان، ترکی اور مصر کے دورے پر روانہ ہوئے۔ (54(

ون یونٹ کو کسی مؤثر عمل کے تحت ختم کروانے اور سندھ کی ملکی حیثیت بحال کروانے کے لیے سندھ کے وطن دوست رہنما سرگرم عمل رہے۔ 29–30 اکتوبر 1955ء کو کامریڈ جتوئی، جی ایم سید اور قاضی صاحب کی مشترکہ کوشش سے ’سندھ اینٹی ون یونٹ فرنٹ‘ قائم کیا گیا۔ اس فرنٹ کا سیکریٹری کامریڈ جتوئی کو مقرر کیا گیا اور قاضی صاحب و دیگر اس کے سرگرم کارکن بن کر کام کرنے لگے اور ون

یونٹ کے خلاف راہ ہموار کرنے کے لیے دورے کا پروگرام بنایا۔ (55)

اس طرح ون یونٹ کے خلاف قاضی صاحب اور دیگر سندھ کے عظیم رہنماؤں نے فیصلہ کن جدوجہد کر کے سندھ دشمنوں کی ناپاک سازشوں کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا اور عوامی حمایت حاصل کر لی۔

عوامی لیگ اور نیپ

قاضی فیض محمد نے ون یونٹ کے خلاف، پاکستان کے بڑے صوبے بنگال کی حمایت حاصل کرنے کے لیے عوامی لیگ سے رابطہ کیا، تاکہ بنگالیوں کو اپنا ہمدرد بنا کر تحریک کو ہمہ گیر بنایا جا سکے۔ اس وقت عوامی لیگ کے صدر شہید حسین سہروردی اور جنرل سیکریٹری محمود الحق عثمانی تھے۔ اسی مقصد کے لیے قاضی صاحب نے عوامی لیگ کے سیکریٹری جنرل کی دعوت پر 1955ء کے آس پاس اپنے دیگر ساتھیوں غلام محمد لغاری اور میر رسول بخش ٹالپور کے ساتھ عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ (56)

عوامی لیگ میں شامل ہوتے ہی قاضی صاحب نے سندھ دیش کے مفادات بنگال کے رہنماؤں کے سامنے رکھے اور انہیں مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کے مسائل سے آگاہ کیا۔ عوامی لیگ، یہاں کے رہنماؤں کے اثر میں آ کر، ابتدا میں ون یونٹ کی مخالفت کرنے لگی اور ون یونٹ کے خلاف جاری جدوجہد میں چھوٹے صوبوں سے بھرپور تعاون کیا۔ قاضی صاحب کو عوامی لیگ کے مرکزی رہنماؤں نے سندھ کے لیے جنرل سیکریٹری مقرر کیا۔ (57(

قاضی صاحب نے پورے سندھ میں عوامی لیگ کی جانب سے ون یونٹ کی مخالفت میں جلسوں کا انتظام کیا۔ میرپور خاص میں کامریڈ غلام محمد لغاری کے تعاون سے ایک شاندار کانفرنس منعقد کی۔ (58(

1955ء میں جب قاضی صاحب عوامی لیگ میں تھے، اس وقت ون یونٹ کے حامی، سندھ دشمن جاگیردار محمد ایوب کھڑو نے

سانگھڑ میں ایک خالی نشست سے سندھ اسمبلی کی رکنیت کے لیے فارم جمع کروایا۔ اس وقت کھڑو کا ملک میں ایسا دباؤ تھا کہ کوئی بھی شخص ان کے مقابلے میں امیدوار بننے کو تیار نہ تھا۔ مگر یہ قاضی صاحب کا حوصلہ تھا کہ اس وقت کے فرعون کے سامنے جرات و ہمت کے ساتھ عوامی لیگ کے ٹکٹ پر فارم جمع کروانے کے لیے سانگھڑ پہنچے۔ (59(

وہ کھڑو کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں:
"دل میں کہا کہ یہ سندھ کا دشمن بغیر مقابلے کے منتخب ہو جائے اور ساری دنیا کو بتایا جائے کہ یہ سندھ کا مقبول لیڈر ہے اور سندھ ون یونٹ کے حق میں ہے، یہ ہماری بڑی بے عزتی ہوگی۔(60) "

قاضی صاحب نامزدگی فارم جمع کروانے کے لیے وہاں پہنچے۔ کھڑو اور پیر علی محمد راشدی نے آئی جی عیسائی کو کہہ کر قاضی صاحب کو پولیس کے ذریعے اغوا کروایا۔ پولیس نے قاضی صاحب کو اغوا کر کے ان پر تشدد کیا اور انہیں ایک گاڑی میں بٹھا کر شہر سے 15–50 میل دور جنگل میں پھینک دیا، اور اس طرح کھڑو بغیر مقابلے کے کامیاب ہو گیا۔ (61)

قاضی صاحب کسی بھی ظالمانہ طاقت سے نہ ڈرے، اور وزیرِ اعلیٰ کھڑو پر شہدادپور میں اغوا کا مقدمہ درج کروایا۔ جب قاضی صاحب عدالت میں سماعت کے لیے آ رہے تھے تو کھڑو نے شہدادپور کے پورے شہر کو پولیس کے گھیرے میں لے لیا، جس کی وجہ سے پولیس نے قاضی صاحب کو شہر کے باہر روک دیا۔ وہ عدالت تک نہ پہنچ سکے اور مقدمہ خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے اس ظلم کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی۔ اس دوران کھڑو، قاضی صاحب سے ملا اور انہیں دھمکی دی:

"قاضی، تم مجھ پر مقدمہ کرنے سے باز نہیں آتے، میں تمہیں سخت تکلیف میں ڈالوں گا۔(62) "

کھڑي نے قاضی صاحب پر ایک جھوٹا مقدمہ درج کروایا کہ قاضی صاحب نے نواب شاہ میں ایک غیر قانونی جلسہ کیا تھا اور اس میں کہا تھا:
"خان عقار خان ادھر تیار ہو کر آ رہا ہے، اِدھر حر اٹھ رہے ہیں۔ آؤ پاکستان کو ختم کرنے کے لیے جہاد کریں۔(63) "

پولیس نے شکایت درج کی۔ بغیر وضاحت کے وارنٹ جاری ہوئے۔ قاضی صاحب نے خود کو ہائی کورٹ کے حوالے کیا اور ضمانت کی درخواست کی، جو منظور ہو گئی۔ مقدمہ جھوٹا ثابت ہوا اور قاضی صاحب کی جان بچ گئی۔

ان مقدمات کے دوران عوامی لیگ کے مرکزی رہنماؤں شہید سہروردی اور شیخ مجیب الرحمان نے ان سے مکمل تعاون کیا۔ عوامی لیگی کارکنوں نے اپنے جنرل سیکریٹری کی بھرپور مدد کی۔ دوسری طرف کھڑو نہ صرف پورے پاکستان بلکہ تقریباً پوری دنیا میں بدنام ہو گیا۔ امریکہ کے اخباروں نے کھڑي کو "Gangster of Pakistan"کہا۔ (64)

جب قاضی صاحب عوامی لیگ میں تھے تو ان کے اس کے رہنماؤں سے اختلافات پیدا ہو گئے، کیونکہ وہ ون یونٹ کے حامی بن گئے تھے۔ ان کے عمل و کردار سے یہاں کے چھوٹے صوبوں کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا۔ عوامی لیگ کے رہنما سہروردی، جو اس وقت ملک کے وزیرِ اعظم تھے، وہ ون یونٹ کے حامی اسکندر مرزا کی باتوں میں آ گئے اور مغربی پاکستان کی وحدت کے نظریے کے حامی بن کر ون یونٹ کے حمایتی بن گئے۔ (65)

قاضی صاحب اور دیگر مغربی پاکستان کے رہنما عوامی لیگ میں اس لیے شامل ہوئے تھے تاکہ بنگال کی حمایت حاصل کر کے ون یونٹ ختم کروایا جائے اور صوبائی حقوق و حیثیتیں بحال کی جائیں۔ اس لیے انہیں عوامی لیگ کی اس پالیسی سے سخت رنج پہنچا اور انہوں نے عوامی لیگ میں مزید رہنا مناسب نہ سمجھا۔

سہروردی نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے 25 ممبروں کی میٹنگ وزیرِ اعظم ہاؤس میں طلب کی۔ چونکہ قاضی صاحب اس کمیٹی کے رکن تھے، اس لیے وہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ سہروردی نے اپنے دفاع میں ایک نرم تقریر کی۔ (66) اس نے امریکہ کی حمایت کی اور ون یونٹ کی حمایت کی۔ (67(

اس وقت بھاشانی جیسے چوٹی کے رہنما بھی موجود تھے، مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ وزیرِ اعظم کے گھر میں اس کی مخالفت میں تقریر کرے۔ آخرکار قاضی صاحب سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے سہروردی کو جواب دیا۔ اسی کے بعد انہوں نے پارٹی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس تقریر کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:
"میرے گروپ نے مجھے سہروردی کو جواب دینے کے لیے کہا۔ میں اپنی تقریر میں بہت تلخ تھا۔(68) "

آل پاکستان نیشنل عوامی پارٹی

جب مولانا بھاشانی اور دیگر رہنما حسین شہید سہروردی سے اختلاف کر کے عوامی لیگ سے باہر نکلے، تو انہوں نے پاکستان نیشنل پارٹی والوں سے بات چیت شروع کی۔ مولانا بھاشانی نے جی ایم سید، خان عقار اور شیخ سندھی سے بات کی کہ نئی پارٹی بنائی جائے۔ بعد میں ہم خیال رہنماؤں نے ڈھاکہ میں ایک میٹنگ رکھی، جس میں قاضی صاحب بھی شریک ہوئے۔ اس میٹنگ میں "آل پاکستان نیشنل عوامی پارٹی " تشکیل دی گئی، جس کے صدر بھاشانی، سندھ صوبے کے صدر شیخ عبدالمجید سندھی اور سندھ کے جنرل سیکریٹری قاضی فیض محمد مقرر کیے گئے۔ (69)

پارٹی کی جانب سے بنگال کے پلٹن میدان میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا گیا، جسے عوامی لیگ کے کارکنوں نے آ کر درہم برہم کر دیا، کیونکہ بنگال میں ان کی حکومت تھی۔ پولیس اور عوامی لیگ کے کارکنوں نے رہنماؤں کو گھیرے میں لے لیا اور جلسے کو منتشر کر دیا۔ سندھ اور دیگر صوبوں کے رہنما جب جلسہ گاہ سے دفتر کی طرف روانہ ہو رہے تھے، تو ان پر پولیس نے حملہ کیا۔ دیگر افراد کے ساتھ قاضی صاحب کو بھی بندوق کے بٹ مار کر زخمی کیا گیا۔ (70)

نیشنل عوامی پارٹی کی بنیاد رکھنے میں قاضی صاحب کا بھی بڑا کردار تھا۔ ڈھاکہ کے کنونشن میں قاضی صاحب نے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی بھرپور وکالت کی۔ جب وہ ڈھاکہ سے سندھ پہنچے تو یہاں دورے کا پروگرام بنا کر نکلے۔ سندھ کے تمام بڑے شہروں میں جلسے کیے۔ خیرپور میرس

میں ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں جی ایم سید، شیخ سندھی، عثمانی، مولانا بھاشانی، خان عقار اور غوث بخش بزنجو وغیرہ شریک ہوئے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے نواب شاہ میں جلسہ کیا، جس میں مذکورہ رہنما بھی شریک ہوئے۔ شہر میں ٹرکوں پر ایک بڑا کسانوں کا جلوس نکالا گیا۔

اس وقت عوامی لیگ، مسلم لیگ اور حکومت نیشنل عوامی پارٹی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے گھبرا کر ان کے جلسوں کو منتشر کرنے اور ان پر مسلح حملے کرنے لگے۔ نواب شاہ کے جلسے میں بھی ان لوگوں نے مخالفت شروع کی، مگر دیہی علاقوں سے آئے ہزاروں کسانوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی، اور جلسہ اپنی شان سے جاری رہا۔ جلسے میں ون یونٹ کے خلاف اور چھوٹے صوبوں کے حقوق کے حق میں بے خوف ہو کر بات کی گئی۔ اس کے بعد نیشنل عوامی پارٹی کی جانب سے ایک بڑی کسان کانفرنس لنڈی شہر میں منعقد کی گئی، جس میں خود مولانا بھاشانی نے شرکت کی۔ (71)

جب 9 نومبر 1957 کو مولانا بھاشانی، صدر نیشنل عوامی پارٹی، سندھ میں نواب شاہ کے دورے پر آئے تو قاضی فیض محمد نے اپنی استقبالیہ تقریر میں بھاشانی کے سامنے سندھ کی بھلائی اور بہتری کے لیے چند سوالات رکھے اور بھاشانی سے کہا کہ اگر ان کی پارٹی سندھیوں کے حقوق اور مطالبات کے لیے آواز بلند کرے گی تو سندھ کے لوگ اس پارٹی کو قبول کریں گے اور اس کا ساتھ دیں گے، ورنہ ہم کسی بھی صورت میں اس پارٹی میں نہیں رہیں گے جو سندھیوں کے مفادات کو نقصان پہنچائے۔

قاضی صاحب نے اپنی استقبالیہ خطاب میں ون یونٹ حکومت کی جانب سے سندھ کی زمینیں سندھی کسانوں سے چھین کر جعلی دعویداروں کو الاٹ کرنے کی پالیسی کے خلاف بھی بات کی اور اس اقدام کی مذمت کی۔ انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی

کے رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ سندھ میں ہونے والے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کریں۔ (72(

عالمی امن کانفرنس:

جب قاضی صاحب نیشنل عوامی پارٹی سندھ کے جنرل سیکریٹری تھے، اس وقت کولمبو (سیلون) میں عالمی امن کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں دنیا بھر کی بائیں بازو کی جماعتوں کو دعوت دی گئی۔ نیشنل عوامی پارٹی کو بھی شرکت کی دعوت ملی۔ قاضی صاحب کو بھی پارٹی کی جانب سے دعوت دی گئی۔ سندھ سے قاضی صاحب، جی ایم سید اور شیخ سندھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تیار ہوئے۔ مگر قاضی صاحب کے روانہ ہونے کے بعد حکومت کو یاد آیا کہ یہ تو ان کے خلاف سرگرم ہیں، لہٰذا باقی افراد کے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس لیے کولمبو میں نیشنل عوامی پارٹی کی قیادت سمیت پورے پاکستان کی بائیں بازو کی جماعتوں کی نمائندگی قاضی صاحب کو تنہا کرنی پڑی۔

قاضی صاحب نے کانفرنس کے ہر پروگرام میں بھرپور جوش و خروش سے حصہ لیا اور وہاں انگریزی میں عالمی امن کے قیام کے لیے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریر کے آخر میں دنیا کے ہزاروں ترقی پسندوں کے سامنے اپنی پیاری زبان سندھی میں یہ شعر پڑھا اور تقریر مکمل کی، جس کا بعد میں انگریزی ترجمہ کر کے سامعین کو شاہ لطیف کے فکر سے روشناس کرایا:

”ڪڍي ڪان ڪمان مان، ميان مارج نه مون؛
مون ۾ آهين تون، متان تنهنجو ئي روڪي لڳي“.

قاضی صاحب کی اس تقریر نے حاضرین پر اچھا اثر چھوڑا۔ دنیا بھر کے رہنماؤں نے تقریریں کیں، جن میں سے 6 تقریریں بہترین قرار دی گئیں، جن میں ایک قاضی صاحب کی بھی تھی۔

قاضی صاحب نے کولمبو میں کئی سندھی ہندوؤں سے ملاقات کی۔ ان کے دکھ درد معلوم کیے۔ انہیں سندھ اور سندھی قوم کی حالت سے آگاہ کیا۔ انہیں ان کے مستقبل کے بارے میں لیکچر دیے۔ کئی وہاں کے سندھیوں نے قاضی صاحب کو دعوتیں دیں۔ (73)

الاٹی تحریک

برصغیر کی تقسیم سے کچھ پہلے سندھی کسانوں نے اپنی ہمت اور جدوجہد کے ذریعے سندھ اسمبلی سے وہ بل پاس کروایا تھا کہ سندھی ہندوؤں نے جو زمینیں سود اور قرض کی واپسی کے بہانے اپنے قبضے میں لی تھیں، وہ کسانوں کو واپس ملنی چاہئیں۔ ابھی وہ بل قانونی شکل اختیار نہ کر پایا تھا کہ تقسیم ہو گئی۔ یہاں کے کسانوں نے نئی حکومت کے سامنے اپنا مطالبہ دہرایا، مگر حکومت نے اس جائز مسئلے پر کوئی توجہ نہ دی اور ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی زمینیں سندھی کسانوں کو دینے کے بجائے باہر سے آئے مہاجرین کے حوالے کرنا شروع کر دیں۔ جس کے خلاف یہاں کے کسانوں نے زبردست تحریک شروع کی۔ جس سے نئی حکومت خوفزدہ ہو کر کچھ زمینیں یہاں کے کسانوں کو الاٹ کر گئی۔

کسانوں نے تحریک کے دوران اپنی چھینی گئی زمینوں پر قبضہ کیا اور حقداروں کو کچھ حقوق ملنے لگے۔ یہ بات باہر سے آئے افراد اور مقامی جاگیرداروں کو ناگوار گزری، کیونکہ کسانوں کی طاقت سے ان کی دائمی اور موروثی حکمرانی کو دھچکا لگا۔ کسانوں کی "کسان حقدار تحریک "کے نتیجے میں تقریباً چالیس فیصد کسان "جو کھیتی کرے وہی کھائے "کے اصول پر عمل پیرا ہو کر راہ پر چلنے لگے۔ (74(

تقریباً چار پانچ سال تک کسان الاٹ شدہ زمینوں کو اپنی سمجھ کر سنوارنے لگے اور ان سے کافی کچھ کمایا۔ آخر سات سال بعد جب سندھ میں غلام محمد بیراج تعمیر ہو گیا اور گڈو بیراج کا کام شروع ہونے والا تھا، تو وہاں کی لاکھوں ایکڑ زمین حکومت نے غیر سندھیوں کے حوالے کرنے کے لیے ون یونٹ

نافذ کیا، تو باہر کے قابض افراد نے الاٹی کسانوں سے بھی اپنا پرانا بدلہ لینے کی تیاری کی۔ اور سندھی کسانوں کی الاٹمنٹ کے سابقہ احکامات منسوخ کر کے مرکزی حکومت نے وہ زمینیں زبردستی غیر سندھیوں کو الاٹ کرنا شروع کیں۔ جن سندھی کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کیا گیا، ان کے گاؤں تباہ کیے گئے اور انہیں بے دخل کر دیا گیا۔ ون یونٹ کے سائے میں ایک نئی قیامت برپا ہو گئی۔

الاٹ شدہ زمینوں کے علاوہ سندھ کے بیراجوں کی زمینیں، جن پر سندھی عوام کا پیسہ اور پسینہ صرف ہوا تھا، وہ زمینیں بھی سندھیوں کے بجائے مہاجرین، پنجابی فوجیوں اور چودھریوں، کشمیریوں اور پٹھانوں میں مفت تقسیم کی گئیں یا انہیں معمولی معاوضے پر دی گئیں۔

حکومت کے اس کھلے ظلم اور استحصال کے خلاف سندھ کے تمام باشعور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، احتجاج ہوئے، تحریکیں چلیں۔ اس ظلم اور جبر کے خلاف یہاں کے تمام رہنماؤں نے جدوجہد کی۔ اس تحریک میں قاضی صاحب کے کردار پر آگے لکھنے سے پہلے ان چھینی گئی اور مفت میں غیر سندھیوں کو دی گئی زمینوں کے اعداد و شمار پیش کیے جاتے ہیں:

(1)اُس وقت کی سرکاری رپورٹوں کے مطابق سندھ کے صرف جنوبی حصے میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کی غیر قانونی جائیداد کا پتہ لگایا گیا، جو غیر قانونی طور پر مہاجرین کو الاٹ کی گئی تھی۔ (روزنامہ کاروان حیدرآباد – 18 دسمبر 1958)

(2)حیدرآباد اور خیرپور کے اسپیشل آبادکاری کمشنر نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ حیدرآباد اور خیرپور ڈویژن میں تین مہینوں کے اندر 8650 مہاجر دعویداروں کو 2 لاکھ ایکڑ زمین الاٹ کی گئی ہے اور گزشتہ 11 سالوں میں مہاجرین کو 4 لاکھ ایکڑ زمین دی گئی ہے۔ (حوالہ: 23.1.1959)

(3)کوٹری بیراج کی دس ہزار ایکڑ زمین آزاد کشمیر کے لوگوں میں تقسیم کی گئی۔ (حوالہ: 3.2.1959)
(4)کوٹری بیراج کی چالیس ہزار ایکڑ زمین کراچی کے مہاجرین کے لیے رکھی گئی ہے۔ ضلع سانگھڑ میں ایک ہزار فوجی خاندانوں کو آباد کیا گیا ہے۔ ان خاندانوں کو 50 ہزار ایکڑ زمین دی گئی ہے۔ (حوالہ: 31.12.58)
(5)مکی جھیل میں ایک لاکھ ایکڑ زمین پر فوجی خاندان آباد کیے جائیں گے۔ (حوالہ: 24.4.54)
(6)کوٹری بیراج کے علاوہ گڈو بیراج کی بھی لاکھوں ایکڑ زمین غیر مستحق اور غیر حاضر زمینداروں کے حوالے کی گئی۔ یہاں تک کہ جہاں صدیوں سے مقامی لوگ گاؤں بنا کر بچوں سمیت آباد تھے، وہ زمینیں بھی غیر سندھیوں کو دی گئیں اور اصل باشندوں کو ان کے آبائی ٹھکانوں سے بے دخل کر دیا گیا۔

ان اعداد و شمار سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ون یونٹ حکومت کو یہاں کے لوگوں کی سلامتی کا کتنا خیال تھا۔ انہی حالات میں، اسی ماحول میں قاضی فیض ﷴ نے سندھ کے مزدوروں کے تحفظ اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے الاٹی تحریک چلائی۔ انہوں نے یہ تحریک نیشنل عوامی پارٹی کے پلیٹ فارم سے چلائی، کچھ سندھ ہاری کمیٹی کے کارکنوں اور کمیونسٹوں نے بھی ان کی مدد کی۔ (75)

انہوں نے پہلے لنڈی اسٹیشن میں کسانوں کا بڑا جلسہ منعقد کیا، جس میں مولانا بھاشانی، خان عبدالصمد خان اور دیگر چوٹی کے رہنما شریک ہوئے۔ (76)

قاضی فیض ﷴ چونکہ انتہائی جذباتی اور حساس دل رکھنے والے انسان تھے، اس لیے وہ کسانوں کی بربادی برداشت نہ کر سکے۔ کسانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاجاً نواب شاہ میں مرنے تک بھوک ہڑتال کی۔ آٹھ دن بعد بھی جب حکومت

کے کان پر جوں تک نہ رینگی، تو تمام ساتھیوں نے تحریک کو کسی اور طریقے سے چلانے کا سوچا اور کسانوں کا جلسہ منعقد کر کے قاضی صاحب سے بھوک ہڑتال ختم کروائی گئی۔ (77)

اس کے بعد انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ یہ تحریک تعلقہ کنڈیاری کے شہر محرابپور سے شروع کی۔ انہوں نے کنڈیاری اور نوشہرو تعلقہ کے کونے کونے میں اپنی 'کسان جیپ' میں سوار ہو کر کسانوں تک رسائی حاصل کی۔ اس کے بعد محرابپور کے قریب ایک غریب کسان عورت کے گاؤں میں کیمپ قائم کیا۔ کیمپ پر کامریڈ جمال الدین بخاری ان کے ساتھ رہے۔ حکومت نے شہر پر دفعہ 144 نافذ کر دی۔ جب تک پولیس انہیں گرفتار کرنے آئی، اس سے پہلے ہی انہوں نے کیمپ شہر سے آدھا میل دور منتقل کر دیا، جو دفعہ 144 کی حدود سے باہر تھا۔ وہاں 10–15 رہنما رہنے لگے۔ انہوں نے دفعہ 144 کو گروہوں کی صورت میں توڑنا شروع کیا۔ روزانہ کسان گرفتاری دینے آتے تھے۔ اس طرح 111 کسان قید ہو گئے۔ (78)

حکومت پھر بھی کسانوں سے بات کرنے اور انہیں حقوق دینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے اعلان کیا کہ کم از کم 5000 کسان جمع ہوں تو وہ بھی ان کے ساتھ گرفتاری دیں گے۔ مگر اس دن صرف 100 کسان جمع ہوئے اور انہوں نے اس تعداد کو مؤثر نہ سمجھا، اس لیے وہ جیل نہ گئے۔

حکومت نے بھی کسانوں پر ظلم و تشدد کا بازار گرم کر دیا۔ جو کسان گرفتاریاں دے رہے تھے، حکومت نہ صرف انہیں جیلوں میں اذیت دے رہی تھی بلکہ ان کی جائیدادیں بھی ضبط کرنے لگی، تاکہ کسان جھک کر خاموش ہو جائیں اور تحریک مزید نہ بڑھ سکے۔ کیونکہ اس تحریک کی کامیابی غیر سندھیوں اور مقامی قابضوں کے لیے موت کا پیغام بننے والی

تھی۔ سو حکومت کی پوری مشینری نے کمزور، بے ہتھیار کسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے۔ کسانوں کی بڑی تعداد میں گرفتاری اور جائیدادوں کی ضبطی تحریک کو نقصان پہنچا رہی تھی۔ اس لیے قاضی صاحب اور دیگر تحریک کے مرکزی کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ تحریک کو باقی رکھنے اور مزدوروں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ گرفتار شدگان کو آزاد کروایا جائے اور جائیدادیں واپس دلائی جائیں، ورنہ کسانوں میں مایوسی اور بے چینی پھیل جائے گی۔ اس کے بعد انہوں نے ڈپٹی کمشنر کے پاس اپیلیں کیں اور تمام کسانوں کو آزاد کروایا اور ان کے جرمانے بھی معاف کروائے۔ (79)

جب قاضی صاحب محرابپور کے قریب سول نافرمانی کی یہ تحریک چلا رہے تھے، انہی دنوں نیشنل عوامی پارٹی کی میٹنگ حیدرآباد میں ہوئی۔ وہ کیمپ میں ہونے کی وجہ سے میٹنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ اس میٹنگ میں پارٹی کے انتخابات ہوئے۔ چونکہ قاضی صاحب پہلے ہی سندھ کے جنرل سیکریٹری تھے، اس لیے دوستوں نے ان کی غیر موجودگی میں انہیں جنرل سیکریٹری کے عہدے کے لیے نامزد کیا۔ ان کے مقابلے میں کامریڈ غلام محمد لغاری کھڑے ہوئے۔ جی ایم سید نے غلام محمد لغاری کی حمایت کی، جبکہ ان کے بیٹے امداد محمد شاہ اور کامریڈ سوبھو گیانچنداڻي نے قاضی صاحب کی حمایت کی۔ الیکشن میں قاضی صاحب کامیاب ہوئے اور دوبارہ سندھ نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔ (80)

جب سول نافرمانی کی تحریک ناکام ہوئی تو قاضی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے فیصلہ کیا کہ مرکزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے، تاکہ کراچی والوں کو خبر ہو کہ سندھی کسانوں کے ساتھ کیا ظلم ہو رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ

پورے سندھ کا دورہ کیا اور کسانوں کو کراچی میں مظاہرے کے لیے تیار کرنے لگے۔

انہوں نے 1958ء کے اکتوبر مہینے میں کراچی کے گولیمار علاقے میں ایک بڑی کسان کانفرنس منعقد کی، جس میں پورے سندھ سے ہزاروں کسان شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی صدارت سندھ نیشنل عوامی پارٹی کے صدر شیخ عبدالمجید سندھی نے کی۔ کانفرنس میں قاضی صاحب نے مطالبہ کیا کہ الاٹی کسانوں کو الاٹ شدہ زمینیں مناسب قیمت پر فروخت کی جائیں۔ کانفرنس کے بعد کراچی میں ایک بڑا جلوس نکالا گیا، جس کی قیادت ایک بزرگ کسان عورت نے کی۔ کئی خواتین نے بھی جلوس میں شرکت کی۔ (81(

پھر اگلے دن صدر کے علاقے میں جلسہ رکھا گیا، جس میں بھی ہزاروں کسان شریک ہوئے۔

کسانوں کے اس اقدام نے حکومت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ حکومت نے سندھی مزدوروں کی اصل طاقت کا اندازہ لگانے کے بعد کسان رہنماؤں سے بات چیت کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ صدر اسکندر مرزا سے قاضی فیض محمد کی قیادت میں ایک وفد نے ملاقات کی۔ اس وفد میں شیخ عبدالمجید سندھی، عثمانی اور کامریڈ عبدالقادر شامل تھے۔ (82(

صدر اسکندر مرزا قاضی صاحب کی تجاویز سے متفق ہوا، مگر اس نے کہا کہ جب تک سندھ کے وزرا اور یہاں کے ایک طبقے کے لوگ متفق نہ ہوں گے، تب تک حکومت کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گی۔

ابھی یہ بات چیت جاری ہی تھی کہ ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ سول حکومت ختم ہو گئی، تمام وزارتیں تحلیل ہو گئیں۔ جمہوری طریقے سے کام کرنے کے تمام راستے بند ہو گئے۔

تحریک ادھوری رہ گئی۔ مارشل لا حکومت نے قاضی صاحب کو جیل میں ڈال دیا۔ (83)

مارشل لا کے بعد سندھی کسانوں پر ظلم اور جبر مزید بڑھ گیا۔ سندھ کی زرخیز زمینیں سندھی کسانوں سے طاقت کے زور پر چھین کر دوسروں کو دے دی گئیں۔ کسان دربدر ہو گئے۔

قاضی صاحب اس صورتحال میں بھی مایوس نہ ہوئے، بلکہ مسلسل عمل کے میدان میں سرگرم رہے۔ نئے انداز اور طریقوں سے کام کرنے کے راستے تلاش کرنے لگے۔ کیونکہ عارضی شکستیں دائمی کامیابیوں کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ یہ سوچنا کہ کچھ نہیں ہوگا، ایک بڑا دھوکہ ہے۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کسان آخرکار ایک دن کامیاب ہوں گے، غلام قومیں ایک دن آزادی کے جھنڈے لہرائیں گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان مسلسل عمل میں رہے، مایوس نہ ہو، تھکے نہیں۔

ایوبی مارشل لا

ون یونٹ کے خلاف جیسے جیسے عوامی ردِ عمل بڑھتا گیا، ملک میں خاص طور پر چھوٹے صوبوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ سندھ کے سیاستدان اس ظلم و ستم کے نظام کو ختم کرنے کے لیے مسلسل سرگرم رہے۔ انہوں نے ون یونٹ توڑنے کے لیے ''سندھ اینٹی ون یونٹ فرنٹ ''کی سرگرمیوں کو تیز کیا۔ اس فرنٹ کی کوششوں سے 1957ء میں مغربی پاکستان اسمبلی میں ون یونٹ کے خلاف بل پیش کیا گیا، جو 300 میں سے 296 ممبروں کی بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا۔ اب حکومت کے پاس اس نظام کو برقرار رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ مگر قابض طبقات اپنی لوٹ مار اتنی آسانی سے چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔

جب ستمبر 1958ء میں ملک کے تمام رہنماؤں نے مل کر ون یونٹ کے خاتمے کا مطالبہ کیا تو فوجی جنتا نے ایوب خان کی قیادت میں اکتوبر میں ملک پر قبضہ کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دستور ساز اسمبلی ختم کر دی گئی، وزارتیں تحلیل کر دی گئیں، جمہوریت کا خاتمہ کر کے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ یہ تمام اقدامات ون یونٹ کو بچانے، عوامی

تحریکوں کو ختم کرنے اور استحصالی طبقے کی لوٹ مار جاری رکھنے کے لیے کیے گئے۔

فوجی جنتا نے سندھ اور باقی ملک کے جمہوریت پسند رہنماؤں کو تلاش کر کے انتقام کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے دیگر رہنماؤں سمیت قاضی فیض محمد کو بھی جیل بھیج دیا گیا۔ (84(

قاضی صاحب کو قید میں رکھنے کے لیے دفعہ 108 کے تحت جھوٹا مقدمہ بنایا گیا۔ یہ مقدمہ نواب شاہ میں درج کیا گیا اور ان پر دوسرا مقدمہ ٹنڈو آدم میں داخل کیا گیا۔ جب بھی انہیں عدالت لے جایا جاتا، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور کمر میں رسی باندھی جاتی۔ (85) آخرکار مقدمے جھوٹے ثابت ہوئے اور انہیں چھ ماہ بعد رہا کر دیا گیا۔

ایوبی دور میں قاضی صاحب ون یونٹ کے خاتمے اور جمہوریت کی بحالی کے لیے بھرپور کوششیں کرنے لگے۔ انہوں نے ون یونٹ کو سندھ پر مسلط کرنے کا ذمہ دار سندھ کے اقتدار پرست وڈیروں اور پیروں کو ٹھہرایا، جنہوں نے اپنے مفادات حاصل کرنے اور سندھی عوام کی طبقاتی سوچ و شعور کو ختم کرنے کے لیے یہ سازش کی۔ انہوں نے سندھ کی بحالی کے لیے دیگر صوبوں کے اشتراک سے تحریک چلانے کی جدوجہد کی۔ وہ اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اگر سندھی اور دیگر چھوٹے صوبوں کے لوگ متحد ہو کر کوشش کریں تو ون یونٹ ضرور ختم ہو گا۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:
"ون یونٹ کو ختم کرنا کوئی شہد کی مکھی سے شہد لینا نہیں ہے، جو آسانی سے حاصل ہو جائے۔ یہ قبر ہمارے سندھ کے بڑے لوگوں نے سندھیوں کو دفن کرنے کے لیے کھودی ہے... اس قبر کو ختم کرنے کے لیے ہم تمام سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں اور ہمارے ہمدرد پنجابیوں و بنگالیوں کو کوشش کرنا

ہو گی۔ اگر صحیح طریقے سے کوشش کی گئی تو ون یونٹ ضرور ختم ہو گا۔(86) "

ون یونٹ کے دور میں جب کرائے کے ادیب اور دانشور ون یونٹ کو تاریخی تقاضا سمجھ کر اسے حق پر مبنی قرار دینے لگے، اور قوموں کی جدید شناخت کو رد کر کے اپنے مفادات کی خاطر مسلم قوم کا راگ الاپنے لگے، تو قاضی صاحب نے انہیں منہ توڑ جواب دیا، انہیں بے نقاب کر کے عوامی عدالت میں پیش کیا۔ ون یونٹ کے بارے میں سندھ دشمن گروہ کو جواب دیتے ہوئے وہ کہتے تھے کہ یہ ایک سازش ہے، سندھیوں کو ختم کرنے اور باہر سے آئے افراد کو ایک الگ وطن دینے کی۔ ان کی زبان کو بڑھانے اور پھیلانے کے لیے میدان فراہم کرنے کی۔ اس لیے اگر ون یونٹ ختم نہ کیا گیا تو سندھی ختم ہو جائیں گے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:
"یہ بھی اردودانوں کے کچھ رہنماؤں کا منصوبہ ہے کہ سندھ کی سرحدیں کھولی جائیں، اور جب ان کی آبادی سندھیوں سے بڑھ جائے، تب دروازے بند کر کے سندھ کو ختم کر دیا جائے... یہ سب سندھ کو ختم کرنے کے منصوبے ہیں۔ ہم سندھ کو ہرگز ہرگز قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سندھ کا خاتمہ یعنی ایک کروڑ زندہ انسانوں کا خون، پانچ دس ہزار سال پرانی تہذیب اور زبان کا خون۔ زمین کے غائب ہونے کے بعد بھی سندھ کی خوشبو سندھیوں کی روحوں کے ساتھ ہمیشہ قائم رہے گی۔(87) "

ایوبی آمریت کے دور میں قاضی فیض محمد فوجی آمریت کے خاتمے، جمہوریت کی بحالی اور بنیادی انسانی حقوق کے حصول کے لیے ہر پلیٹ فارم سے جدوجہد کرتے رہے۔ انہوں نے اس تاریک دور میں نواب شاہ میں تمام سیاسی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا۔ شہر میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باوجود جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں بڑے بڑے رہنما

شریک ہوئے اور ایوبی مارشل لا کے خلاف آئندہ کا پروگرام تشکیل دیا گیا۔

1964ء میں ایوب خان نے خود کو سول صدر منتخب کرانے کے لیے صدارتی انتخابات کا اعلان کیا، تاکہ مارشل لا کو جاری رکھنے کے لیے قانونی جواز حاصل کیا جا سکے، اور اپنی آمریت کو مزید مضبوط کر کے جمہوری قوتوں اور چھوٹے صوبوں کی خودمختاری کے مطالبات کو کچلا جا سکے۔ نیشنل عوامی پارٹی نے اس کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کا نام تجویز کیا، تاکہ اس آمر جنرل کو شکست دی جا سکے۔ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں نیشنل عوامی پارٹی نے خاص مدد کی۔ (88(

قاضی فیض محمد نے بھی پارٹی کے فیصلے کے مطابق نواب شاہ ضلع میں محترمہ فاطمہ جناح کی بھرپور انتخابی مہم چلائی۔ پمفلٹ، اشتہارات اور اپیلیں شائع کر کے عوام کو ایوب خان کے خلاف ابھارا۔ وہ اپنی گاڑی پر سوار ہو کر ضلع کے ہر ووٹر تک پہنچے۔ (89(

انہوں نے درج ذیل بنیادوں پر "بنیادی جمہوریتوں کے ووٹروں "سے ایوب کے خلاف ووٹ دینے کی اپیل کی: (90(
(1)ون یونٹ کو حل کرنے کے بجائے ایوبی دور میں حکومت طاقت کے زور پر یونٹ چلا رہی ہے۔
(2)ہماری گردنوں میں امریکہ کی غلامی کی زنجیریں مزید مضبوط ہو گئی ہیں۔
(3)سندھ کی زمینیں، نوکریاں اور قدرتی وسائل ہم سے چھین لیے گئے ہیں۔

انہوں نے ان نکات کو بنیاد بنا کر فاطمہ جناح کی زبردست انتخابی مہم چلائی۔ مگر ایوب خان نے اپنی طاقت کے زور پر انتخابات میں دھاندلی کروا کر خود کو صدر منتخب کروا لیا۔

اس کے باوجود صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح نے 80 ہزار میں سے 30 ہزار ووٹ حاصل کیے۔ (91)

لاہور میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی۔ قاضی صاحب اس میں شریک ہوئے۔ یہاں ون یونٹ کے خلاف پمفلٹ چھاپ کر تقسیم کیے۔ وہاں مارشل لا کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا۔ سندھ کے سیاستدانوں نے اس کانفرنس میں قاضی صاحب کو سبجیکٹ کمیٹی میں شامل کیا۔ (92)

اس طرح وہ ہر جگہ سندھیوں کے حقوق کا مقدمہ نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے۔

عوامی لیگ میں اہم کردار

1967ء میں قاضی صاحب کے پاس قمر الزمان، کنوینر عوامی لیگ، شیخ مجیب الرحمان کا پیغام لے کر آئے کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہوں کیونکہ عوامی لیگ اپنے پروگرام میں ون یونٹ کی مخالفت شامل کر رہی ہے۔ قمر الزمان نے قاضی صاحب کو ڈھاکہ میں عوامی لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی اور کہا کہ اس میٹنگ میں ون یونٹ کے خلاف قرارداد منظور کی جائے گی۔ قاضی صاحب اس میٹنگ میں یہاں کے دیگر ساتھیوں سمیت شریک ہوئے۔
ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں نہ صرف ون یونٹ کے خلاف قرارداد منظور ہوئی بلکہ عوامی لیگ کے رہنماؤں نے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی خودمختاری اور حقوق کی بھرپور حمایت کی۔ جس کے باعث قاضی صاحب دوبارہ عوامی لیگ میں شامل ہوئے۔ (93(

اس کے بعد انہوں نے عوامی لیگ کے رہنماؤں کے ساتھ پورے بنگال کا دورہ کیا۔

عوامی لیگ نے ملک میں جمہوریت کی بحالی اور صوبائی خودمختاری کے حصول کے لیے دیگر جمہوریت پسند جماعتوں کے ساتھ مشترکہ محاذ قائم کیا، تاکہ مل کر فوجی آمریت کے خلاف آواز بلند کی جا سکے۔ اس مشترکہ محاذ میں

قاضی فیض محمد کو مغربی پاکستان کی 'ڈئک' کونسل پر عوامی لیگ کی جانب سے منتخب کیا گیا۔

مشترکہ محاذ کی میٹنگ میں ون یونٹ کے خلاف قرارداد پیش کی گئی۔ دیگر تمام جماعتوں نے اس فیصلے کو بنگالیوں پر چھوڑ دیا۔ بنگالیوں نے قاضی صاحب سے مشورے کے بعد ون یونٹ کی مخالفت کی اور صوبائی خودمختاری کی حمایت کی۔ میٹنگ میں پنجاب کے نمائندوں نے بلوچستان کی آزادی پر اعتراض کیا کہ بلوچستان چھوٹا صوبہ ہے، اس لیے نہ صرف اپنا انتظام چلانے کے قابل نہیں بلکہ اقتصادی طور پر بھی خودمختار نہیں رہ سکتا۔ اس نکتے پر شیخ مجیب الرحمان نے قاضی صاحب سے رائے لی۔ قاضی صاحب نے بلوچوں کی وکالت کرتے ہوئے ضروری اعداد و شمار پیش کیے اور بلوچستان کی خودمختاری پر زور دیا۔ جس کی بنیاد پر بلوچستان کو الگ صوبہ بنانے کی قرارداد منظور ہوئی۔ (94(

مارچ 1969ء میں عوامی تحریک کے دباؤ کے باعث ملک کے فوجی آمر ایوب خان نے حکومت کی باگ ڈور ایک اور فوجی جنرل یحییٰ خان کے حوالے کی اور خود منظر عام سے ہٹ گیا۔ یحییٰ خان حالات کے دباؤ میں آ کر عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا۔ انتخابات کے اعلان کے فوراً بعد قاضی فیض محمد بنگال کے دورے پر روانہ ہوئے۔ وہ پیاسی، جیسور اور بوگرا وغیرہ گئے۔ اس کے بعد شیخ مجیب الرحمان نے آل پاکستان عوامی لیگ کی ایک بڑی کانفرنس ڈھاکہ میں طلب کی۔ اس میں شرکت کے لیے قاضی صاحب سندھ سے ایک بڑا وفد لے کر پہنچے، جس میں امداد شاہ، غلام نبی پٹھان اور دیگر شامل تھے۔ اس کانفرنس میں عوامی لیگ کا دستور بھی منظور کیا گیا۔ اس دستور کی تیاری میں قاضی صاحب کا بھی بڑا کردار تھا۔ اسی کانفرنس میں قاضی صاحب کو عوامی لیگ کا مرکزی سینئر وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ (95)

قاضی فیض محمد سندھ واپس آتے ہی عوامی لیگ کو مضبوط بنانے اور اس کی شاخیں سندھ کے کونے کونے میں کھولنے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ 15 ستمبر 1969ء کو جام صادق علی کی رہائش گاہ پر عوامی لیگ کی آرگنائزنگ کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت قاضی صاحب نے کی۔ اس اجلاس میں سندھ میں پارٹی دفاتر کھولنے کا پروگرام بنایا گیا۔ 28 ستمبر 1969ء کو حیدرآباد میں عوامی لیگ کا صوبائی دفتر کھولا گیا، جس کا افتتاح قاضی صاحب سے کروایا گیا۔

ون یونٹ کو توڑنے، صوبائی حقوق بحال کرنے اور جمہوریت کی واپسی کے لیے مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں نے مل کر جدوجہد کرنے کا پروگرام بنایا۔ سندھ، بلوچستان، سرحد کے متحدہ محاذ کے قیام کے لیے چھوٹے صوبوں کے سیاستدانوں نے کوششیں شروع کیں۔ اس محاذ کے قیام کے عمل میں قاضی صاحب کا بھی بڑا کردار رہا۔ اس سلسلے میں بلوچستان متحدہ محاذ کی جانب سے 30 ستمبر 1969ء کو کوئٹہ میں ایک کنونشن منعقد کیا گیا، تاکہ مشترکہ محاذ قائم کیا جا سکے۔ اس کنونشن میں شرکت کے لیے جی ایم سید، آغا غلام نبی پٹھان اور قاضی صاحب کو دعوت دی گئی۔ (96)

اس کنونشن میں تینوں صوبوں کے تقریباً 2000 سیاسی کارکنوں نے شرکت کی اور انہوں نے مل کر ایک قرارداد کے ذریعے ون یونٹ کو توڑ کر صوبے بحال کرنے کا مطالبہ کیا اور 1956ء کے آئین اور زونل فیڈریشن کی تجویز کی مخالفت کی۔ (97)

اس کنونشن میں قاضی فیض محمد نے تقریر کرتے ہوئے چھوٹے صوبوں کے عوام سے اپیل کی کہ وہ عوامی لیگ کے 6 نکات کی حمایت کریں، کیونکہ انہی نکات کی بنیاد پر چھوٹے صوبے نہ صرف اپنا وجود بچا سکتے ہیں بلکہ روز روز کی فوجی آمریت سے بھی نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے

تقریر کرتے ہوئے کہا:
"بنگالی اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ ون یونٹ کے خاتمے کے لیے بھی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ہم اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں۔(98) "

1970ء کے انتخابات میں عوامی لیگ نے اپنے 6 نکاتی پروگرام کے تحت الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جس کے مطابق نہ صرف بنگال بلکہ پاکستان کے دیگر چھوٹے صوبوں کے حقوق کا بھی تحفظ کرنا تھا۔ ایسی یقین دہانی عوامی لیگ کی جانب سے چھوٹے صوبوں اور خاص طور پر سندھ کے رہنماؤں کو دی گئی تھی۔ اس لیے قاضی فیض محمد نے عوامی لیگ کے 6 نکات کو سندھ اور پاکستان کے دیگر چھوٹے صوبوں کے عوام تک پہنچانے کے لیے بھرپور جدوجہد کی، تاکہ ان کی بنیاد پر بنگالیوں کے ساتھ مل کر اپنی خودمختاری حاصل کی جا سکے۔

عوامی لیگ کے ان نکات کی مخالفت یہاں کے وڈیروں، جاگیرداروں اور غیر سندھیوں کے ایجنٹوں کے سوا کسی بھی جماعت نے نہیں کی۔ مگر عوامی شعور بیدار نہ ہونے اور غیر سندھی ایجنٹوں کی سازشوں و مکاریوں کی وجہ سے لوگ عوامی لیگ کے پروگرام کو اپنا نہ سکے۔ سندھ میں مجیب کے 6 نکات کی مخالفت صرف ذوالفقار علی بھٹو، محمد ایوب کھوڑو اور اے کے بروہی جیسے غیر سندھی ایجنٹوں اور وطن فروش وڈیروں نے کی۔ قاضی صاحب نے ان تینوں افراد کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا اور ان پر پریس بیانات میں الزام لگایا کہ یہ افراد بنگالی عوام، سندھ اور دیگر صوبوں کے عوام کے درمیان اتحاد کی فضا کو خراب کر رہے ہیں۔

قاضی صاحب نے اس حوالے سے اپنے ایک پریس بیان میں کہا:
"ان تین صاحبان کے سوا چھوٹے صوبوں کے کسی بھی

سیاسی رہنما نے بنگال کے 6 نکاتی مطالبات کی مخالفت نہیں کی ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ تینوں صاحب ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں، مگر پنجاب کا دورہ کرنے کے بعد انہوں نے تینوں صوبوں اور بنگال کے عوام میں سیاسی یکجہتی کی مخالفت کی ہے۔ اور جو لوگ بنگال کے 6 نکاتی پروگرام کی مخالفت کرتے ہیں، وہ بالواسطہ طور پر ون یونٹ کی حمایت کر رہے ہیں۔ عوام کو ان کی منافقانہ چالوں سے آگاہ ہونا چاہیے۔(99) "

1970ء کے انتخابات اور ڈھاکہ سانحہ

دسمبر 1970ء کے عام انتخابات میں قاضی فیض محمد عوامی لیگ کے پلیٹ فارم سے نواب شاہ حلقے سے قومی اسمبلی کے امیدوار بنے۔ ان کے مقابلے میں مرکزی امیدوار شبیر احمد شاہ (قیوم مسلم لیگ) اور حاکم علی زرداری (پیپلز پارٹی) تھے۔ (100) جی ایم سید جیسے قوم پرست رہنما نے قاضی فیض صاحب کی حمایت کرنے کے بجائے سید پرستی کی بنیاد پر قیوم لیگ کے امیدوار شبیر احمد شاہ کی حمایت کی۔ حالانکہ سندھ میں عوامی لیگ اور متحدہ محاذ نے مل کر انتخابی امیدوار کھڑے کیے تھے اور قاضی صاحب عوامی لیگ اور سندھ متحدہ محاذ کے مشترکہ امیدوار تھے۔ مزید یہ کہ قاضی صاحب 6 نکات کی بنیاد پر انتخاب لڑ رہے تھے، جو قوم پرستوں اور سندھ دوستوں کے لیے کشش رکھنے والے اور فائدہ مند تھے۔ جی ایم سید سے کہا گیا:
"سائیں! وڈیرے، وڈیروں کے یار——ہم جتنی بھی قربانیاں دیں، مگر ہماری قدر نہیں ہوگی-(101) "

انتخابات سے قبل انتخابی سیاست کا تجزیہ میر امداد علی اپنی کتاب میں یوں کرتا ہے۔ وہ قاضی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:
"قاضی فیض محمد، بے داغ، باہمت اور ون یونٹ کی مخالفت میں جہاد کرنے والا مردِ مجاہد ہے۔ مقامی وکیل، نیشنل عوامی

پارٹی اور جی ایم سید کا دوست ہے۔ اگر ون یونٹ کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے والے مجاہدین کو دیکھا جائے اور سندھ کے لیے بے داغ خدمت کرنے والوں کا جائزہ لیا جائے تو انگلیوں پر گنے جانے والوں میں قاضی فیض محمد بھی ایک ہے۔ بعض باتوں میں تو جی ایم سید سے بھی زیادہ زور ہے۔ کیونکہ جی ایم سید کی سید پرستی، سندھ پرستی سے کچھ اوپر ہے اور قاضی صاحب کی سندھ پرستی مسلم پرستی سے بھی بلند ہے... مگر نام چڑھا چور سزا کھائے، نام چڑھا تاجر فائدہ اٹھائے—— سو پیپلز پارٹی کی ہے سرسی، اور عوام کی ذہنی قوت بھی بہت کمزور ہے۔ سب لکیر کے فقیر بنے پھرتے ہیں۔ اس لیے سخت مقابلہ حاکم علی زرداری اور شبیر احمد شاہ کے درمیان ہوگا۔(102) "

اور آگے چل کر قاضی صاحب انتخابات میں ہار گئے۔

انتخابی دنوں میں قاضی صاحب کے پاس پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کئی بار آئے اور انہیں پیشکش کی کہ نواب شاہ کی نشست آپ کو دلائی جائے گی اور پارٹی میں بھی اہم عہدہ دیا جائے گا۔ آپ پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ مگر قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کی پارٹی کے پروگرام سے متفق نہیں ہوں اور آپ پنجاب میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے اور ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے چھوٹے صوبوں کے مفادات کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ جبکہ عوامی لیگ کی کامیابی چھوٹے صوبوں کے عوام کے لیے نیک فال ثابت ہوگی۔

انتخابی دنوں میں شیخ مجیب الرحمان مغربی پاکستان کے دورے پر آئے۔ انہوں نے قاضی صاحب کے ساتھ سندھ کے تین شہروں میں عوامی جلسوں سے خطاب کیا: پہلے کراچی، پھر نواب شاہ اور آخر میں شکارپور۔ ان کا نواب شاہ والا جلسہ انتہائی کامیاب رہا۔ (103(

مغربی پاکستان میں پنجاب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھٹو صاحب اور مسلم لیگیوں نے عوامی لیگ کے 6 نکات کی سخت مخالفت شروع کی۔ ان کی مخالفت کا جواب قاضی فیض محمد ہی تنہا دیتے رہے، اور قاضی صاحب نے پیپلز پارٹی کی دو رخی پالیسی کی سخت مخالفت کی اور 6 نکات کا دفاع کیا۔ انہوں نے مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کو منظم کرنے کے لیے پنجاب اور سرحد کے دورے کیے۔ بہاولپور اور ملتان گئے، جہاں وکلاء برادری سے ملاقات کی۔ لاہور میں ایک بڑی کانفرنس طلب کی۔ وہاں بھٹو صاحب پر سخت تنقید کرتے ہوئے انہیں پاکستان کے عوام کا دشمن قرار دیا۔ اس کے بعد کراچی میں پریس کانفرنس کر کے بھٹو کی پالیسی پر سخت تنقید کی۔ وہ بھٹو کی مخالفت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بھٹو صاحب سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا۔ مسئلہ سندھ کا تھا۔ میں سمجھتا ہوں، خودمختاری جتنی شیخ صاحب اور عوامی لیگ کے اقتدار میں آنے سے ملے گی، وہ بھٹو صاحب سے نہیں مل سکتی۔(104) "

یحییٰ خان نے دسمبر 1970ء میں انتخابات اس لیے کرائے کہ عوامی دباؤ کو کم کرے، دائیں بازو کی جماعتوں کو جتوائے، اور ان کی فوجی چھتری کے نیچے حکومت قائم کر کے خود اس کا سربراہ بنے۔ اسے پورا یقین تھا کہ دونوں حصوں میں کوئی جماعت واضح اکثریت حاصل نہیں کرے گی اور نہ ہی کوئی حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہوگی۔ اس لیے وہ سب جماعتوں کو خوش رکھ کر خود ہی حکومت چلائے گا۔ مگر انتخابات کے بعد عوامی لیگ نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ جس سے یحییٰ خان کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اور فوجی جنتا انتخابات کے مثبت نتائج سامنے آنے کے بعد اقتدار دینے سے انکار کرنے لگی۔

عوامی لیگ نے مطالبہ کیا کہ مارشل لا ختم کر کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے تاکہ عوامی لیگ 6 نکاتی

فارمولے کے تحت آئین سازی کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ بات فوجی جنتا اور پنجاب کے مستقل مفادات کے لیے خطرناک محسوس ہوئی، اور انہیں اس میں اپنا زوال نظر آیا۔ مزید یہ کہ عوامی لیگ کے اقتدار میں آنے سے اس کے 6 نکات مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کو اتنے اختیارات دے دیتے کہ کبھی بھی فوجی ٹولہ اقتدار پر قابض ہو کر جمہوریت کا جنازہ نہ نکال سکتا، اور نہ ہی چھوٹی قوموں کے حقوق پر ڈاکا ڈالا جا سکتا۔ اس لیے فوجی جرنیلوں نے عوامی لیگ کو اقتدار دینے کے بجائے اس پر ظلم شروع کیا اور مشرقی پاکستان کی جمہوری قوتوں کو کچلنے کے لیے وہاں فوج بھیجنا شروع کی۔ فوج کی مکمل تیاری تک صدر یحییٰ، شیخ مجیب کو بات چیت میں الجھائے رکھا۔

24مارچ 1971ء کو آخری میٹنگ رکھی گئی۔ اس میٹنگ میں شرکت کے لیے شیخ مجیب الرحمان نے سندھ سے قاضی فیض محمد کو ڈھاکہ بلایا۔ انہوں نے قاضی صاحب کو پوری صورتحال سے آگاہ کیا۔ 24 مارچ کو پورے پاکستان کے رہنما، سوائے پیپلز پارٹی کے، شیخ مجیب کے پاس آئے۔ اس اجلاس میں قاضی صاحب بھی شریک ہوئے۔ اجلاس میں ولی خان، مفتی محمود، شاہ احمد نورانی اور غوث بخش بزنجو نے بات چیت کی اور شیخ مجیب کو درست قرار دیا۔ فیصلہ ہوا کہ تمام رہنما یحییٰ خان سے ملاقات کریں گے اور شیخ صاحب کے مطالبات منوانے کی کوشش کریں گے۔ مگر یحییٰ خان نے مطالبات قبول نہ کیے۔ (105(

آخری بار بات چیت ناکام ہونے کے بعد شیخ مجیب الرحمان نے قاضی فیض کو اپنے پاس بلایا اور کہا:
"بات چیت ناکام ہو گئی ہے۔ دن پورے ہو چکے ہیں۔ کل یا پرسوں یہاں گولہ باری ہوگی۔ اب آپ کو واپس جانا چاہیے۔ اگر جانے کا کوئی راستہ نہ ملا تو میں آپ کو کسی بنگالی کے گھر ٹھہراؤں گا۔(106) "

قاضی صاحب نے شیخ مجیب سے پارٹی کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں پوچھا:
"وہ کہاں ہیں؟"
تو انہوں نے جواب دیا:
"وہ بھارت چلے گئے ہیں، اور میں بنگالیوں کا رہنما ہوں۔ مجھے بھاگنا نہیں ہے۔ مجھے ان کے ساتھ مرنا ہے۔(107) "

قاضی صاحب کو ایک طیارے میں جگہ مل گئی اور وہ دیگر مغربی پاکستان کے سیاستدانوں اور اعلیٰ افسران کے ساتھ کراچی پہنچے۔

25مارچ 1971ء کی آدھی رات کو پاکستان کی فوج نے بنگالی عوام کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ٹینکوں، جنگی جہازوں اور مشین گنوں سے مظلوم عوام کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کا کھیل شروع ہوا۔ 30 لاکھ افراد گولیوں کا نشانہ بنے۔ ہزاروں عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ لاکھوں افراد اپنے آبائی علاقوں کو چھوڑ کر سرحدیں پار کر کے بھاگنے لگے۔ شہر اور دیہات بموں اور ٹینکوں کے گولوں سے راکھ میں تبدیل ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مشرقی پاکستان ایک نئی آزاد اور خودمختار ریاست بنگلہ دیش کی صورت میں دنیا کے نقشے پر دوبارہ نمودار ہوا۔

سندھی زبان کی بقا کے لیے جدوجہد

قاضی فیض محمد کی زندگی جہاں سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد کا مظہر رہی، وہیں انہوں نے سندھی زبان کی بقا اور تحفظ کی جنگ میں بھی کبھی پیچھے قدم نہ ہٹایا. وہ اپنی مادری زبان سے ازلی عشق رکھتے تھے، اور جب بھی سندھی زبان پر کوئی مشکل وقت آیا، وہ خاموش نہ بیٹھے۔ تقریر، تحریر، بھوک ہڑتال، جیل اور خونی حملوں کا سامنا کرتے ہوئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔

پاکستان بننے کے بعد سندھی زبان کو بیرونی غیر مقامی باشندوں کی زبان سے مسلسل خطرات لاحق رہے۔ اس بقا اور تحفظ کی جنگ میں کئی قومی رہنماؤں، کارکنوں، کسانوں، مزدوروں، طلبہ اور خواتین نے حصہ لیا۔ سندھ میں زبان کا مسئلہ 1954ء کے آئین کی تشکیل کے وقت اور پھر 1956ء میں آئین بننے کے موقع پر ابھرا۔ اس کے بعد یہ مسئلہ 1961ء میں شدت اختیار کر گیا، جب ایوب خان کے دورِ حکومت میں تعلیمی اصلاحات کے لیے قائم کردہ کمیشن نے 1962ء میں اپنی سفارشات پیش کیں۔

ان سفارشات کے تحت سندھی زبان کو حاصل حقوق اور سہولیات سے انحراف کرتے ہوئے اس کی حیثیت کو کم کیا گیا۔ اسے نصاب میں صرف پانچویں جماعت تک لازمی قرار دیا گیا۔ سندھی پڑھنے والوں کے ذریعے تعلیم کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اردو بولنے والے بچوں کے لیے سندھی کا لازمی پرچہ ختم کر دیا گیا وغیرہ۔ (108(

سندھی زبان کے ساتھ ہونے والے اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف سندھ سمیت پورا ملک اٹھ کھڑا ہوا، اور سب نے اس فیصلے کی مذمت کرتے ہوئے اسے شرمناک قدم قرار دیا۔ ملک کی قومی اسمبلی کے ارکان، سیاستدانوں، طلبہ، ادیبوں اور دیگر طبقات نے اس کی مخالفت کی۔ نہ صرف سندھ کے عوام نے اس کے خلاف احتجاج کیا، بلکہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش)، بلوچستان اور سرحد کے رہنماؤں نے بھی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کو سندھیوں کے ساتھ ناانصافی قرار دیا۔

اس سلسلے میں قاضی فیض محمد بھی پیچھے نہ رہے۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے رہنماؤں نے حکومت سے جو مشترکہ مطالبہ کیا، اس پر جن 21 اہم رہنماؤں نے دستخط کیے، ان میں قاضی صاحب بھی شامل تھے۔ قاضی صاحب نے اس دور میں ہر پلیٹ فارم سے سندھی زبان کے حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ آخرکار وقت کے حکمران عوام کے دباؤ کے باعث مجبور ہو کر سندھی زبان کی وہی حیثیت برقرار رکھنے پر مجبور ہوئے۔

ووٹر لسٹیں سندھی میں شائع کرانے کی جدوجہد

1970ء کے انتخابات ہونے والے تھے، اس لیے حکومت نے اعلان کیا کہ ووٹر لسٹیں صرف اردو اور بنگالی زبان میں تیار کی جائیں گی۔ حکومت کا یہ اعلان سندھی زبان کے ساتھ تعصب اور دشمنی پر مبنی تھا۔ کیونکہ اس سے 22 سال پہلے انگریزوں کے دور میں لسٹیں سندھی میں شائع ہوئی تھیں۔ بعد میں ون یونٹ کے ابتدائی دور میں بھی لسٹیں سندھی میں شائع کی گئی تھیں، مگر اس وقت سندھی زبان کو نظرانداز کر کے اس سیدھے سادے مسئلے پر حکومت ضد پر قائم رہی۔

حکومت کے اس غلط فیصلے کی سندھی زبان بولنے والوں نے مذمت کی اور اپنے جائز حق کا مطالبہ کیا۔ اخبارات میں اداریے لکھے گئے، قراردادیں منظور ہوئیں، بیانات جاری ہوئے اور احتجاج کیے گئے، مگر حکومت نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس لیے سندھی طلبہ نے اس مسئلے کے حل کے لیے تحریک شروع کی کہ لسٹیں سندھی میں بھی شائع کی جائیں۔ 8 نومبر 1969ء کو طلبہ نے مظاہرے کیے۔ اس کے بعد طلبہ رہنما لالا قادر بھوک ہڑتال پر بیٹھا۔ پورے سندھ میں علامتی بھوک ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ جلوس نکالے گئے اور جلسے کیے گئے۔ (109(

طلبہ نے لسٹیں سندھی میں شائع کرانے کے علاوہ درج ذیل مطالبات بھی کیے:

(1)ون یونٹ ختم کیا جائے۔

(2)سندھ یونیورسٹی کے ملازمین کے خلاف مقدمات واپس لیے جائیں۔

مگر سب سے اہم مطالبہ سندھی لسٹوں کا ہی تھا۔

طلبہ کے ان مطالبات کی پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور سندھ متحدہ محاذ کے صدر جی ایم سید نے بھی حمایت کی۔ قاضی فیض محمد، جو اس وقت آل پاکستان عوامی لیگ کے مرکزی نائب صدر تھے، انہوں نے بھی حکومت کی اس ہٹ دھرمی کی مذمت کی اور طلبہ کے جائز مطالبات کی حمایت کی۔ 11 نومبر 1969ء کو انہوں نے حمایتی پریس بیان کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ اگر مطالبات پورے نہ ہوئے تو وہ بھی مرنے تک بھوک ہڑتال کریں گے۔ (110(

طلبہ کے ان مطالبات کی حقیقی اور عملی حمایت عوامی لیگ نے ہی کی، اور اس کے مرکزی نائب صدر نے طلبہ کا بھرپور ساتھ دیا۔ طلبہ کی تحریک کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"یہ سندھی لسٹوں کا مطالبہ سیاستدانوں کو کرنا چاہیے تھا، نہ کہ بچوں طلبہ کو۔(111) "

قاضی صاحب کو 10 نومبر 1969ء کو "شامِ سندھ "والوں کی دعوت ملی تھی، یہ فنکشن طلبہ منعقد کر رہے تھے۔ وہ اس فنکشن میں شریک ہوئے۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"ہمارے بچے سندھ اور سندھی زبان کے لیے بھوک ہڑتالیں کر رہے ہیں۔ ہمیں بھی ان کی ہمدردی میں کچھ قربانی دینی چاہیے۔(112) "

فنکشن ختم ہونے کے بعد وہ بھوک ہڑتالی طلبہ کے پاس گئے اور انہیں پھولوں کے ہار پہنائے۔ دوسری بار جب وہ طلبہ سے ملنے گئے تو ان کی حالت دیکھ کر جوش میں آ گئے اور اعلان کیا:
"اگر طلبہ کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو میں بھی مرنے تک بھوک ہڑتال کروں گا۔(113) "

آخرکار وہ 14 نومبر 1969ء کو بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ ان کی بھوک ہڑتال کے باعث یہ تحریک بڑھ کر عوامی تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمان نے بھی تحریک کی حمایت کی۔ جب تحریک زور پکڑنے لگی اور پورا سندھ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا تو بڑے بڑے لیڈروں کی دکانداری کو دھچکا لگنے لگا۔ جس پر جی ایم سید نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے اسے ختم کرنے کا مشورہ دیا۔ اس بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:
"جی ایم سید نے اس تحریک کی مخالفت کی اور قانونی طریقے سے حق حاصل کرنے کی جدوجہد پر زور دیا، مگر یہ تجویز ہمیں ناپسند تھی۔(114) "

جی ایم سید کی مخالفت کے باعث کئی بھوک ہڑتالی طلبہ مایوس ہو گئے اور بھوک ہڑتال ختم کرنے کا سوچنے لگے۔ مگر قاضی صاحب نے طلبہ کو سمجھایا کہ یہ ہماری بے عزتی ہوگی، اگر بغیر مطالبات منوائے تحریک خودبخود ختم کر دیں۔ دشمن ہمیں طعنہ دیں گے، بزدل اور کرائے کے لوگ کہیں گے۔ پھر کون ہمارے پیچھے آئے گا؟ اس کے بعد طلبہ بھوک ہڑتال جاری رکھنے پر راضی ہو گئے۔

بھوک ہڑتالیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے پاس فلسطینی، بنگالی اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشنز کے طلبہ بھی آنے لگے۔ قاضی صاحب نے بھوک ہڑتال کے دوران یہ بیان جاری کیا:

"سندھ عظیم اور قدیم ملک ہے۔ سندھی زبان اور ثقافت کی جڑیں عوام کے دلوں میں گہرائی سے پیوست ہیں۔ بدقسمتی سے غیر ملکی ثقافت کے ذریعے سندھ اور سندھیوں کو تباہ کرنے کی سازش ہو رہی ہے، مگر ہم اس کے خلاف جدوجہد کر کے شاہ لطیف اور دیگر صوفی شاعروں کے تصور کے مطابق ایک نئی سندھ وجود میں لائیں گے۔(115) "

قاضی صاحب سندھ کے پہلے سیاستدان تھے، جنہوں نے عملی طور پر اس تحریک میں شامل ہو کر خود کو سندھ اور سندھیوں کا سچا خادم ثابت کیا۔ تحریک کا سارا کریڈٹ، جو پہلے چند بیان باز اور موقع پرست لیڈروں کے کھاتے میں جانا تھا، وہ قاضی صاحب، عوامی لیگ اور محب وطن طلبہ کے حصے میں آ گیا۔

قاضی صاحب کے تحریک میں شامل ہونے سے سندھ دشمنوں کی طرف سے بڑے پیمانے پر مخالفت شروع ہو گئی۔ غیر سندھی اس تحریک کی دشمنی پر اتر آئے۔ مخالفت میں جلسے جلوس نکالے گئے۔ مہاجر رہنما نواب مظفر نے ایک پریس کانفرنس میں کہا:
"سندھ کے کونے کونے میں بھوک ہڑتالیوں کی وجہ سے امن و امان کی کوششیں کمزور ہو گئی ہیں، اور پاکستان عوامی لیگ کے نائب صدر قاضی فیض محمد کے بھوک ہڑتال میں شامل ہونے کے بعد شہر کا ماحول بہت خراب ہو گیا ہے۔ قاضی فیض محمد سیاسی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔(116) "

اگلے دن، 16 نومبر کو، قاضی صاحب نے نواب صاحب کو جواب دیتے ہوئے پریس بیان میں کہا:
"میں حیدرآباد کی ایک فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوں۔ اس سے جھگڑے یا قانون شکنی شروع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم اپنی جانیں قربان کرنے کے مقصد سے پرامن جدوجہد کر رہے ہیں۔(117) "

17نومبر کو کامریڈ غلام محمد لغاری بھی بیمار ہونے کے باوجود خود کو اٹھوا کر بھوک ہڑتال پر بیٹھے۔ بھوک ہڑتالیوں کے پاس کسان، طلبہ، خواتین، کارکن اور رہنما آنے لگے۔ تحریک جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی، سندھ دشمنوں کو یہ بات ناگوار گزری۔

حکومت نے ظلم اور دھونس سے اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے 18 نومبر کی رات ایک بجے بھوک ہڑتالی کارکنوں کے کیمپ پر حملہ کیا۔ پولیس اور مہاجر غنڈوں نے بھوک ہڑتالیوں پر لاٹھیوں، گھونسوں اور بندوقوں کے بٹوں کی بارش کر دی۔ ان سب کی ہڈیاں توڑ دیں۔ کامریڈ لغاری کو شدید ضربیں لگیں، ان کا سر پھٹ گیا۔ پولیس نے سب کو اٹھا کر حیدرآباد سینٹرل جیل میں بند کر دیا۔ اگلے دن پورے سندھ میں بھوک ہڑتالیوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ (118(

قاضی فیض محمد اور دیگر کارکن جیل میں بھی بھوک ہڑتال پر رہے۔ پانچ دن بعد بھٹو صاحب بھی بھوک ہڑتالیوں سے ملنے آئے۔ قاضی صاحب نے بھٹو سے کہا کہ اگر ہمارے مطالبات پورے کیے جائیں تو ہم تحریک ختم کر دیں گے۔ پہلا مطالبہ: ون یونٹ ختم کیا جائے۔ دوسرا: ووٹر لسٹیں سندھی میں شائع کی جائیں۔

جیل میں مزید 8 دن گزر گئے۔ پورے سندھ میں بھوک ہڑتالیوں کی حمایت میں مظاہرے ہونے لگے۔ ایک دن میڈیکل کے طلبہ اور طالبات نے آ کر جیل کے باہر دھرنا دیا کہ بھوک ہڑتالیوں کو طبی امداد دی جائے۔ جس کے بعد قاضی صاحب اور ان کے ساتھیوں کی جانچ کے لیے ڈاکٹروں کی ٹیم آئی۔

جیل میں قاضی صاحب اور غلام محمد لغاری کو طلبہ سے الگ رکھا گیا۔ کئی طلبہ روزانہ گرفتار ہوتے رہے، اور بہادر طالبہ

اختر بلوچ بھی گرفتار ہو کر آئی۔ قاضی صاحب اس بہادر بیٹی کی حوصلہ افزائی کے لیے روزانہ اسے خطوط لکھتے تھے۔

26نومبر کو قاضی صاحب کی حالت بہت خراب ہو گئی اور وہ بستر پر موت کا انتظار کرنے لگے۔ آخرکار حکومت نے جدوجہد کرنے والوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے، اور سندھ کے عوام کی برسوں سے جاری جدوجہد رنگ لے آئی۔

28نومبر کو ون یونٹ کو ختم کرنے کا اعلان کیا گیا، اور 29 نومبر کو ووٹر لسٹیں سندھی زبان میں شائع کرنے کا اعلان کیا گیا۔ 30 نومبر کو ایکشن کمیٹی کی جانب سے بھوک ہڑتال ختم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ (119(

اس کے بعد قاضی صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بھوک ہڑتال ختم کی۔ پھر 8 دسمبر کو وہ جیل سے آزاد ہوئے—سندھ کے نئے وجود اور سندھی زبان کی حیثیت کی تسلیم شدہ کامیابی کا تحفہ لے کر۔

سندھی زبان کو قومی زبان بنانے کی تحریک

سندھ میں زبان کے مسئلے پر دوبارہ اس وقت کشیدگی بڑھی، جب 1973ء کے آئین کی تشکیل کے وقت سندھیوں کے پرانے جائز مطالبے کو نظرانداز کرتے ہوئے حکومت نے 8 فیصد اقلیت کی زبان اردو کو ملک کی قومی زبان قرار دیا۔ حکومت کے اس اقدام کو ناجائز اور غیر منصفانہ قرار دیتے ہوئے سندھی عوام جدوجہد کے میدان میں اتر آئے۔ ہر طبقے نے سندھی زبان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی اور مطالبہ کیا کہ سندھی کو بھی پاکستان کی قومی زبان تسلیم کیا جائے اور اسے سندھ کی واحد سرکاری زبان بنایا جائے۔ (120)

صرف اردو کو قومی زبان بنانے کا مطلب سندھیوں کے سیاسی، ثقافتی، معاشی اور لسانی حقوق کا کھلا استحصال ہے۔ اردو کو قومی زبان بنانے سے سندھیوں کے حقوق غضب ہوں گے، اور اردو کی بنیاد پر غیر سندھی افراد سندھ میں بلا روک ٹوک داخل ہو کر سندھیوں کو اقلیت میں تبدیل کر کے سندھ کو تقسیم کرنے کی سازش کریں گے۔ (121)

جی ایم سید، قاضی فیض محمد اور دیگر رہنماؤں نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور حکومت کے اس اقدام کی سخت مذمت و مخالفت کی۔ (122)

ان دنوں صدر ذوالفقار علی بھٹو کراچی کے دورے پر آئے۔ وہاں بھٹو صاحب نے قاضی صاحب سمیت دیگر سیاستدانوں کو بلایا اور ان سے رائے لی کہ بنگلہ دیش اور بھارت سے کس نوعیت کے تعلقات رکھے جائیں۔ اس ملاقات میں قاضی صاحب نے بھٹو کو الگ لے جا کر کہا کہ سندھی زبان کا مسئلہ بلاوجہ اچھالا گیا ہے اور ایک غیر ضروری طوفان کھڑا کیا گیا ہے۔ صدر بھٹو نے قاضی صاحب سے کہا کہ وہ سندھی زبان کے حق میں ایک نوٹ لکھ کر دیں۔ (123)

قاضی صاحب نے وہ نوٹ انگریزی میں لکھ کر انہیں بھیجا۔ اس نوٹ میں قاضی صاحب نے سندھی زبان کی تسلیم کے لیے واضح اور وزنی دلائل دے کر ثابت کیا کہ سندھی پاکستان کی واحد ترقی یافتہ اور مہذب زبان ہے، جو زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی سے استعمال ہو سکتی ہے۔ (124)

انہوں نے اس نوٹ میں صدر بھٹو کو سندھی زبان کی اہمیت سے آگاہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا:

1. سندھی کو قومی زبان تسلیم کیا جائے۔
2. سندھی کو سندھ کی واحد سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔

قاضی صاحب نے صدر بھٹو سے گزارش کی کہ اگر اس کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں، تو کم از کم سندھی کو اسی حالت میں رہنے دیا جائے، جیسی وہ پاکستان سے پہلے اور بعد میں رہی ہے۔ اس نوٹ میں انہوں نے بھٹو کو خبردار کیا کہ سندھ میں دو زبانوں کا سرکاری طور پر رائج ہونا سندھی زبان کے

لیے تباہی ثابت ہوگا، اور یہ بات سندھ کے عوام، خاص طور پر نوجوان طبقہ، کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کرے گا۔

7جولائی 1972ء کو سندھ اسمبلی میں زبان کا بل پیش کیا گیا، جو بھاری اکثریت سے منظور ہو گیا۔ صرف 11 غیر سندھی ممبروں نے اس کی مخالفت کی اور سندھ میں ہنگامے شروع کر دیے، جن کا کوئی جواز نہ تھا۔ اردو پاکستان کی قومی زبان تسلیم ہو چکی تھی، مگر وہ سندھی کو صرف سندھ کے اندر بھی محدود مقام ملنے پر برہم تھے۔

زبان کے مسئلے کو بنیاد بنا کر غیر سندھیوں نے کراچی، حیدرآباد، ٹنڈو جام اور ٹنڈو الہیار میں سندھیوں پر حملے کیے، انہیں قتل کیا، ان کی جائیدادیں تباہ کیں، گھر جلائے اور انہیں اپنے آبائی علاقوں سے نکلنے پر مجبور کیا۔

صدر بھٹو رجعت پسندوں اور اردو شاونزم کے ان ہنگاموں سے متاثر ہو کر 10 جولائی کو راولپنڈی میں "لسانی کانفرنس" بلانے کا اعلان کیا۔ سرکاری طور پر 5 سندھی دانشوروں اور 20 اردو دانشوروں کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ سندھ سے ابتدائی طور پر جی ایم سید، پیر حسام الدین راشدی، شیخ ایاز اور قاضی فیض محمد نے کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کی۔

قاضی صاحب کانفرنس میں شرکت کے لیے نواب شاہ سے کراچی روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر انہیں خبر ملی کہ جی ایم سید اور حسام الدین راشدی نے کانفرنس میں جانے سے انکار کر دیا ہے۔ مجبوراً قاضی صاحب کو تنہا سندھیوں کی نمائندگی کے لیے راولپنڈی روانہ ہونا پڑا۔

جب وہ کانفرنس ہال میں پہنچے تو وہاں 20 اردو دانشوروں کے درمیان وہ واحد سندھی نمائندہ تھے۔ انہوں نے محسوس کیا

کہ اگر اردو کے 20 حامی بولنا شروع کریں تو وہاں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جائے گی۔ اس لیے انہوں نے صدر بھٹو سے مطالبہ کیا کہ انہیں سب سے پہلے تقریر کرنے دی جائے۔ صدر صاحب نے ان کی یہ درخواست قبول کی، اور قاضی صاحب نے سب سے پہلے تقریر کی اور سندھی زبان کا مقدمہ پیش کیا۔

ہم ان کی اس تاریخی تقریر کے چند اہم اقتباسات ماہنامہ ملیر ڈائجسٹ، اگست 1972ء کے شمارے سے پیش کر رہے ہیں:

"سندھی صرف زبان نہیں ہے، بلکہ یہ سندھ کی ثقافت، تہذیب اور تمدن کی صورت ہے، یہ شخصیت ہے، سندھ کی روح کا لباس ہے، جان ہے... سندھی زبان کے مرنے سے سندھ مر جائے گا، باقی اس زمین کے ٹکڑے کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی...

ہماری سندھ کے عوام کی یہ مانگ ہے، جو حق و انصاف پر مبنی ہے، کہ سندھی زبان کو بھی قومی زبان قرار دیا جائے، اور جب نیا آئین بنے تو پنجابی، پشتو، بلوچی اور سندھی زبانوں کو قومی زبانیں تسلیم کیا جائے۔ اردو کو بھی قومی اور رابطے کی زبان بنایا جائے تو ہمیں اعتراض نہیں ہوگا...

صدر صاحب! آپ کا یہ 'لسانی بل' حقیقت میں ہمارے ساتھ ناانصافی ہے، ظلم ہے...

اگر بل میں کوئی رد و بدل نہ کی گئی تو ہمارے نوجوان اپنی جانیں جلانے پر آمادہ ہو جائیں گے، اور یہ ایک چھوٹی قیامت ہوگی...

ہم چاہتے ہیں کہ سندھ میں صرف سندھی واحد سرکاری زبان ہو، اور ہم نہیں چاہتے کہ اردو اور سندھی دونوں سرکاری زبانیں ہوں...

مگر کیا کہیں، اردو کے پردے میں گزشتہ 25 سالوں میں سندھ کا استحصال کیا گیا ہے۔

جن سود خور ہندوؤں نے ہمیں سو سال میں تباہ کیا، ان سے

زیادہ 25 سالوں میں اردودان سرمایہ داروں نے ہمیں لوٹا ہے۔
سب کچھ لے گئے۔ اب اردو کو پردہ بنا کر خود کو حکمران قوم بنا کر ہم پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، اور اس لیے سندھیوں کو حکومت سے باہر کرنا چاہتے ہیں۔
ہم سندھ کو ہرگز ختم نہیں ہونے دیں گے۔
پہلے ہم تمام سندھیوں کو، مجھے سمیت، عربی سمندر میں پھینک دیا جائے، تب سندھ ختم ہو سکتی ہے۔
ہم سندھ کو پاکستان میں باعزت اور خوددار صوبہ بنانا چاہتے ہیں۔
ہم بھائیوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔(125) "

حکومت پر ان فریادوں اور احتجاجوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بھٹو صاحب کی حکومت اور پارٹی نے بڑے صوبے اور ایک مخصوص اقلیت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سندھی زبان کی موت کے دستاویز پر دستخط کر کے سندھ کو دو زبانوں والا صوبہ بنا دیا۔ جو سندھ کے عوام کے ساتھ سراسر ناانصافی اور ظلم تھا۔

آج تک سندھی عوام اپنے اس قومی جمہوری مطالبے کی تسلیم کے لیے مختلف محاذوں پر جدوجہد کر رہے ہیں۔ جس دن ہم جدوجہد کے ذریعے سندھی زبان کی حیثیت تسلیم کرائیں گے، اور اسے پاکستان کی قومی اور سندھ کی واحد سرکاری زبان منوائیں گے—اس دن ہماری یہ عظیم جدوجہد اپنی کامیابی کو پہنچے گی۔

زندگی کے آخری دن

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد باقی ماندہ پاکستان کی صورتحال انتہائی خراب ہو گئی۔ یحییٰ خان نے باقی پاکستان کی باگ ڈور ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کی، جس نے بھارت اور بنگلہ دیش سے تعلقات بہتر بنانے اور نئی پالیسی اختیار کرنے کے لیے کراچی میں تمام سیاستدانوں کو مدعو کیا۔ قاضی صاحب بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ مہاجر اور پنجابی سیاستدان بنگلہ دیش اور بھارت سے کسی قسم کے تعلقات رکھنے کے خواہاں نہ تھے، اور وہ مجیب کو کافر اور غدار قرار دے رہے تھے۔ انہوں نے بھٹو کو مشورہ دیا کہ بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اس پر قاضی صاحب نے ان پر تنقید کرتے ہوئے بھٹو صاحب کو فوراً بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے اور بھارت سے اچھے تعلقات قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے بھٹو صاحب سے صاف الفاظ میں کہا:
"بنگلہ دیش کو فوراً تسلیم کرنا چاہیے اور بھارت سے دوستی رکھنی چاہیے۔ بھارت سے ہمارے رشتے ہیں۔ ہم پاکستانی اور بھارتی ایک ہی زمین سے پیدا ہوئے ہیں۔(126) "

بھٹو صاحب پر قاضی صاحب کے مشوروں کا اچھا اثر ہوا اور انہوں نے قاضی صاحب کے موقف کو درست تسلیم کیا۔

چونکہ قاضی صاحب، شیخ مجیب الرحمان کے اچھے دوست اور ساتھی تھے، اس لیے بھٹو نے شیخ مجیب کے خیالات جاننے کے لیے قاضی صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ قاضی

صاحب نے اس رابطے سے قبل حکومت سے درخواست کی تھی کہ انہیں شیخ مجیب سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔ حکومت نے ان کی یہ درخواست اس بنیاد پر قبول کی کہ شیخ مجیب کے خیالات معلوم کیے جا سکیں۔ اس سلسلے میں ذوالفقار علی بھٹو، قاضی صاحب کے پاس نواب شاہ آئے اور انہیں لندن جانے کی اجازت دی۔

قاضی صاحب، شیخ مجیب سے ملاقات کے لیے لندن پہنچے۔ شیخ مجیب الرحمان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور محبت سے ملے۔ شیخ مجیب نے قاضی صاحب کو لندن میں رہنے کی پیشکش کی، مگر قاضی صاحب صرف تین ہفتے لندن میں رہنے کے بعد واپس پاکستان آ گئے۔ (127(

بنگال کے ٹوٹنے کے بعد سندھ میں حالات خراب ہونے لگے۔ ایک مخصوص اقلیت نے مجیب الرحمان کے حامیوں اور صوبائی خودمختاری کے حامی رہنماؤں کے خلاف ماحول گرم کیا۔ قاضی صاحب کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا اور ان کی ہر سرگرمی پر نگرانی ہونے لگی۔ جب زبان کے فسادات ہوئے تو سندھی زبان کے حقوق کے لیے قاضی صاحب نے جو تحریک چلائی، اس سے سندھ دشمن عناصر قاضی صاحب سے مزید خوفزدہ ہو گئے۔ حکومت نے بھی قاضی صاحب کی سخت مخالفت شروع کر دی۔

ان تمام باتوں نے قاضی صاحب کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اور انہوں نے کچھ وقت وطن سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ سعودی عرب جانے کے لیے ایئرپورٹ پہنچے، مگر حکومت نے ان کے بیرونِ ملک جانے پر پابندی لگا دی اور انہیں ایئرپورٹ سے واپس گھر بھیج دیا۔

حکومت کے ان اقدامات نے انہیں شدید صدمہ پہنچایا۔ حکومت کے کارندوں اور مخصوص اقلیت کو قاضی صاحب کا وجود

برداشت نہ تھا، کیونکہ قاضی صاحب سندھ کے لیے وہی حقوق مانگ رہے تھے، جو مجیب بنگالیوں کے لیے مانگ رہے تھے۔ اس لیے سندھ دشمنوں نے قاضی صاحب کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، تاکہ یہ حق اور سچ کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے۔

جب قاضی صاحب کو یہ خبریں ملیں اور انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں رہ کر سندھ اور سندھیوں کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا، تو انہوں نے غیر قانونی طور پر ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ ستمبر 1974ء کے ایک دن وہ بغیر اطلاع دیے تھرپارکر سے بھارت روانہ ہوئے۔ راستے میں کئی تکالیف برداشت کرنے کے بعد وہ بھارت کی سرحد پر پہنچے، جہاں بھارتی فوج نے انہیں گرفتار کر لیا۔ جب بھارتی حکومت کو ان کی خبر ملی تو انہیں آزاد کر کے مہمان کی حیثیت سے رکھا۔ بھارتی حکومت نے ان کی آمد کی اطلاع شیخ مجیب کو بھیجی۔

وہ کچھ ہفتے دہلی میں رہنے کے بعد بنگلہ دیش پہنچے۔ وہاں ان کی آمد کو خفیہ رکھا گیا اور انہیں بنگلہ دیش کا خاص مہمان بنا کر رکھا گیا۔ شیخ مجیب نے قاضی صاحب کو بنگلہ دیش حکومت کے خرچ پر ڈھاکہ میں رہنے کی پیشکش کی اور یقین دلایا کہ ان کے اہلِ خانہ کو بھی وہاں بلایا جائے گا۔ اگر وہ لندن میں رہنا چاہیں تو ان کا تمام خرچ عوامی لیگ برداشت کرے گی۔ مگر چونکہ اس وقت بنگلہ دیش کی معاشی حالت بہت خراب تھی، اس لیے قاضی صاحب نے ان پر بوجھ بننا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے وہ کابل پہنچے تاکہ لندن جا سکیں۔ وہاں ان کے دو دن کا خرچ عوامی لیگ نے برداشت کیا۔ وہاں سے وہ لندن روانہ ہو گئے۔

انہوں نے لندن میں تقریباً ایک سال قیام کیا۔ وہاں مقیم سندھی طلبہ سے روابط بڑھائے اور وہاں کے تعلیمی اداروں کے نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ پاکستان حکومت نے قاضی صاحب پر غیر

قانونی طور پر ملک چھوڑنے کا مقدمہ درج کیا اور ان کی شیخ مجیب سے ملاقات کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھا۔ وزیراعظم بھٹو نے بہت کوشش کی کہ قاضی صاحب وطن واپس آئیں۔
وزیراعظم اور وزیراعلیٰ غلام مصطفی جتوئی نے انہیں واپس آنے کے پیغامات بھیجے۔ بعد میں جب جتوئی لندن گئے تو وہاں بھی قاضی صاحب سے ملاقات کی اور انہیں واپسی کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی۔

قاضی صاحب نے جب دیکھا کہ ملک سے باہر رہ کر سندھ کے لوگوں کی خدمت نہیں ہو سکتی، تو وہ واپس آنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک بار وہ برٹش ایئر لائنز کے ذریعے غیر ملکی کی حیثیت سے کراچی ایئرپورٹ پہنچے۔ وہاں سے دو دن پاکستان میں رہنے کی اجازت حاصل کر کے گھر پہنچے۔ ان کی آمد کے ایک ماہ بعد حکومت نے انہیں ہالاٹي سے گرفتار کیا اور کلفٹن پولیس لاک اپ میں رکھا۔ وہاں سے انہیں ضلع ٹھٹھہ کے گھارو بنگلے میں قید رکھا گیا۔ دو تین ہفتے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ اس کے بعد چار ماہ گزرنے کے بعد انہیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ (128) وہاں سے بھی کچھ مہینوں بعد وہ آزاد ہوئے۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے عملی سیاست سے ریٹائرمنٹ لے لی اور اپنی باقی زندگی سندھی ادب کے فروغ کے لیے وقف کر دی۔ انہوں نے اپنے لکھے ہوئے کتابوں کی اشاعت پر توجہ دی۔ ساتھ ہی وکالت بھی جاری رکھی۔

سیاست سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ سندھی کسانوں کو بیدار کرنے کے خیال سے "سندھ ہاری کمیٹی "کے قریب رہے۔ فارغ وقت میں وہ دیہی علاقوں میں جاتے، وہاں کسانوں سے ملاقات کرتے اور انہیں ان کے مسائل سے آگاہ کرتے۔

وفات سے چند ہفتے قبل ان کا ایک حادثہ ہوا اور ان کی بازو ٹوٹ گئی۔ وہ ابھی ٹھیک بھی نہ ہوئی تھی کہ ان کی سماعت نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ وفات سے دو دن قبل وہ نواب شاہ سے ہالاٹي پہنچے۔ وہاں انہیں دل کا دورہ پڑا، جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور 13 اکتوبر 1982ء کو وفات پا گئے۔ انہیں ہالاٹي کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

ادبی اور ثقافتی زندگی

ادبی زندگی

قاضی فیض محمد نہ صرف اصولی سیاستدان اور قومی کارکن تھے، بلکہ ایک عمدہ ادیب، شاعر اور فنکار بھی تھے۔ وہ سیاسی ادب اور فلسفے کے پیچیدہ مسائل پر لکھنے کے ساتھ ساتھ بامقصد ناول اور شاعری بھی تخلیق کرتے رہے۔ ان کی تحریریں سندھی سماج کی عکاسی کرتی ہیں، جن میں یہاں کے محنت کش عوام، کسانوں اور مزدوروں کا درد و دکھ شامل ہے۔

ان کا قلم طبقاتی سماج کے ظلم، جبر، مذہبی نفرت اور تعصب کے خلاف منظم جہاد کرتا ہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعے انہوں نے نہ صرف معاشرے کی خامیوں کو بے نقاب کیا بلکہ ایک سوشلسٹ اور سیکولر معاشرے کی تعمیر کے لیے راستہ بھی دکھایا۔ یعنی ان کی تحریریں نہ صرف ہمارے سماج کی خرابیوں کی زندہ تصویریں ہیں، بلکہ ان میں نئے سماج کی تشکیل کا نقشہ بھی موجود ہے۔

انہوں نے سندھی ادب کو تین ضخیم ناولوں سے مالا مال کیا۔ آج تک سندھ میں ان جیسے اصل، ضخیم اور بامقصد ناول کسی نے تخلیق نہیں کیے۔

قاضی صاحب نے اپنی تمام تصنیفات جیل میں یا وطن سے باہر قیام کے دوران لکھی ہیں۔ باہر کی سیاسی مصروفیات اور گرفتاریوں کے باعث وہ صرف چھوٹے پمفلٹ، مضامین اور

پریس بیانات لکھ پاتے تھے۔ جب حکمران انہیں جیل بھیجتے، تو وہ بیرونی دنیا سے دور ہو کر اپنا وقت مطالعہ اور تحریر میں صرف کرتے۔ انہوں نے ناول "اڻ چاڻ"، "جنسار "اور اپنی سوانح "منهنجو سفر "جیل میں لکھی۔ دیگر کتابیں جیسے "پاویهه سو پاویهه ع"، "Lateefee Sindh in Search of Truth"اور شاعری "دردن سندو داستان) "دو حصے) لندن میں جلاوطنی کے دوران لکھی گئیں۔

انہوں نے مستند کتابوں کے علاوہ کئی مضامین اور مقالات بھی لکھے، جو زیادہ تر سندھ کے موجودہ مسائل پر اس وقت کے اخبارات میں شائع ہوئے۔ اگر ان کے مضامین، تقاریر، پمفلٹ، دوستوں کو لکھے گئے خطوط اور موصولہ خطوط کو جمع کر کے شائع کیا جائے، تو سندھی ادب میں پانچ چھ ضخیم تصنیفات کا اضافہ ہو سکتا ہے، اور یہ اہم تخلیقات محفوظ ہو کر تاریخ کا حصہ بن سکتی ہیں۔

قاضی صاحب کی اہم تصانیف:

1. **جنسار**
348صفحات پر مشتمل ناول، 1980 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ 1954 میں سکھر جیل میں لکھا گیا۔ اس میں تقسیم سے پہلے کے سندھی سماج، جاگیردارانہ ظلم اور ہندو-مسلم منافرت کی کوششوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔
2. **پاویهه سو پاویهه ع**
309صفحات، 1979 میں شائع ہوا۔ اس میں مستقبل کا سماج، سائنسی ترقی، تہذیب، اقدار اور انسانیت کے بہتر مستقبل کا خواب بیان کیا گیا ہے۔
3. **سورن سندي سيج**
251صفحات، 1970 میں نواب شاہ سے شائع ہوا۔ اس میں علامہ آئی آئی قاضی کے خطوط، تاثرات، فلسفیانہ

مضامین، سوانحی خاکے اور 1969 کی سندھی زبان تحریک کا احوال شامل ہے۔

4. **علامه آءِ آءِ قاضي**

60صفحات، 1981 میں شائع ہوا۔ علامہ قاضی سے وابستہ یادوں اور سندھ کی سیاست و سماج پر روشنی ڈالتا ہے۔

5. **هاري ڪاميٽي ۽ الاٽي تحريڪ**

96صفحات، 1984 میں شائع ہوا۔ سندھ ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک کی جدوجہد پر مبنی، طبقاتی تحقیق کے لیے اہم ماخذ۔

6. **دردن سندو داستان**

شاعری کی دو جلدیں، 1980 اور 1982 میں نواب شاہ سے شائع ہوئیں، مجموعی طور پر 1000 صفحات۔ موضوعات میں مارئي، سسئي، سهڻي، حب الوطنی اور روحانیت شامل ہیں۔ نثری تصنیفات کے مقابلے میں شاعری کم پختہ ہے۔

7. **Lateefee Sindh in Search of Truth**

134صفحات، 1979 میں شائع ہوا۔ سندھ کی فلسفیانہ روایت، لطیف سائیں کی سورمیاں، اور فکری موضوعات جیسے مادہ، وجود، خودی، سیاست، حسن، راگ پر بحث۔

8. **منهنجو سفر**

ایک ہزار صفحات پر مشتمل سوانح عمری، بعد میں شائع ہوئی۔ اس میں قاضی صاحب کی زندگی، سیاسی تحریکیں، حالاتِ سندھ اور رہنماؤں کے کردار کا تفصیلی ذکر ہے۔ یہ 20ویں صدی کی تاریخ کا اہم دستاویز ہے۔

9. **اٹ چاٹ**

200صفحات پر مشتمل ناول، ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ یہ بھی ان کے دیگر ناولوں کی طرح وزنی اور بامقصد ہے، جس کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

ان کے علاوہ کئی چھوٹے کتابچے، مضامین، مقالات (شائع شدہ و غیر شائع شدہ) مختلف رسائل اور افراد کے پاس محفوظ ہیں، جو اتنے ہی اہم ہیں جتنے اوپر درج کتابیں۔

راگ سے محبت

قاضی فیض محمد نہ صرف ادیب تھے بلکہ ایک عمدہ فنکار بھی تھے۔ ان کی آواز نہایت سریلی اور دل موہ لینے والی تھی۔ وہ پانچ چھ سال کی عمر سے لے کر بڑھاپے تک راگ سے وابستہ رہے۔ وہ اپنے وقت کے برصغیر کے عظیم گلوکاروں—الہ دینو نوناری، استاد بڑے غلام علی خان اور برکت علی خان—کے دوست تھے۔ وہ ان کے ساتھ محفلیں کرتے اور انہیں بلا کر راگ کی محفلیں بھی منعقد کرواتے تھے۔

ان کے مطابق انہوں نے سب سے زیادہ اثر استاد بڑے غلام علی خان سے لیا، اور ان کے راگ میں استاد الہ دینو نوناری کا رنگ تھا۔ وہ اپنے استاد کے ساتھ درباری، بھیروی اور میاں کی ٹوڑی جیسے راگ گاتے تھے اور ان راگوں کے فن سے بخوبی واقف تھے۔

اپنے کالج کے زمانے میں وہ سر بنانے کے لیے صبح سویرے تنبورا لے کر سمندر کے کنارے جاتے اور ریاض کرتے۔ اپنی آخری عمر میں وہ حیدرآباد گئے اور وہاں اپنے راگ کی دو کیسٹیں ریکارڈ کروائیں، جو کلاسیکی کلام پر مبنی تھیں۔ راگ کے فن پر انہوں نے کئی مضامین اور مقالات بھی لکھے۔ اس کے علاوہ انسٹیٹیوٹ آف سندھالوجی نے ان کے آخری دنوں میں راگ پر ایک خاص انٹرویو بھی لیا، جس میں انہوں نے

سندھ میں راگ کے ماضی، حال اور مستقبل پر خوبصورت انداز میں گفتگو کی۔

جب 1971ء میں وہ سیاست سے کنارہ کش ہوئے، تو اس کے بعد راگ کو ہی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ ہارمونیم لے کر دیہاتوں میں نکل جاتے۔ پہلے کسانوں کو جمع کر کے انہیں راگ سناتے، پھر ان کے مسائل پر گفتگو کرتے اور انہیں سماجی شعور دینے اور عوامی بیداری پیدا کرنے کے لیے لیکچر دیتے۔

اپنی آخری عمر میں انہوں نے کوشش کی کہ سندھ کے کلاسیکی راگ کو دوبارہ زندہ کیا جائے، اور سندھ میں راگ سکھانے اور اسے صحیح اظہار کا ذریعہ بنانے کے لیے ایک اکیڈمی قائم کی جائے۔ مگر عمر نے وفا نہ کی، اور وہ اپنی حسرتیں اور ارمان دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انہیں سندھ کے موجودہ راگ کے بارے میں شدید فکر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ سندھ سے راگ ختم ہو چکا ہے۔ ان کے مطابق حقیقی راگ کلاسیکی راگ ہے، جو بذاتِ خود ایک سائنس ہے، جس سے آج کے فنکار محروم ہیں۔ وہ موجودہ دور کے گلوکاروں کے بارے میں کہتے تھے کہ انہیں نہ ریاض کا علم ہے اور نہ فن کی سمجھ۔ آج کوئی بھی گلوکار تان، پلٹا اور سرگم نہیں پڑھتا۔ آج کی موسیقی بکھری ہوئی دلی کے ٹھکوں جیسی ہے۔

مختصر یہ کہ وہ ہر پلیٹ فارم سے حق اور سچ کی آواز بلند کرتے رہے، اور ایسی تاریک راتوں میں بھی مایوس نہ ہوئے، بلکہ بیداری کی شمع جلاتے رہے۔

حوالہ جات

1. جی جوت جلائی ویا، صفحہ 81
2. ساہتی پبلیکیشن، صفحہ 59
3. ظفر عباسی" :کو کو مانھو موتی دانو"
4. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 27
5. جنسار، صفحہ 8
6. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 3
7. میرا سفر، حصہ اول
8. ہماری آزادی کے رہنما، صفحہ 325–326
9. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 115
10. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 32
11. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 7
12. آئی آئی قاضی، صفحہ 23
13. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 35
14. آئی آئی قاضی، صفحہ 25–26
15. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 115–116
16. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 8
17. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 35
18. سورن سندھی سیج، صفحہ 47–48
19. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 36
20. وہی
21. ہماری آزادی کے رہنما، صفحہ 291 اور 302
22. جی جوت جلائی ویا، صفحہ 15
23. وہی، صفحہ 84
24. آئی آئی قاضی، صفحہ 29–30
25. وہی، صفحہ 31
26. سندھ میں بے چینی کے اسباب، صفحہ 85

27. نبی بخش کوسو" :قاضی فیض محمد – ایک مطالعہ"
28. سندھ میں بے چینی کے اسباب، صفحہ 81–82
29. جی جوت جلائی ویا، صفحہ 85
30. سندھ جو سید، صفحہ 55
31. جی جوت جلائی ویا، صفحہ 22
32. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 198
33. آئی آئی قاضی، صفحہ 28
34. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 116
35. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 10
36. یہ زمین کیسے سنورے (غیر مطبوعہ(
37. "پاکستان – کچھ حقائق کچھ شکایات"، صفحہ 3
38. وہی
39. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 116
40. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 42–43
41. بابائے سندھ کامریڈ حیدر بخش جتوئی، صفحہ 30–31
42. "قاضی فیض محمد – ایک مطالعہ"
43. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 116
44. منتخب سیاسی مضامین
45. روبرو، صفحہ 149
46. سندھ جو سید، صفحہ 56
47. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 116–117
48. اس کنونشن کے متعلق کافی مواد میرے پاس ہے، طوالت کی وجہ سے یہاں شامل نہیں کیا گیا۔
49. سندھ جو سید، صفحہ 56
50. سندھ میں بے چینی کے اسباب، صفحہ 89
51. وہ دن وہ شیر – 3، صفحہ 413
52. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 117
53. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 10–11
54. میرا سفر – 4، صفحہ 419 تا 437
55. آج بھی چکیم چاک، صفحہ 295–296
56. میرا سفر – 4، صفحہ 441

57. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 117
58. میرا سفر – 4، صفحہ 442
59. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 11–12
60. میرا سفر – 4، صفحہ 446
61. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 12
62. وہی
63. میرا سفر – 4، صفحہ 467
64. وہی، صفحہ 470
65. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 117
66. میرا سفر – 4، صفحہ 444
67. جی جوت جلائی ویا، صفحہ 88
68. وہی
69. ہوندا سی حیات، صفحہ 40 اور 93
70. میرا سفر – 4، صفحہ 471–473
71. وہی، صفحہ 506–509
72. بشانی کو خوش آمدیدی خطاب
73. عالمی امن کانفرنس کا مکمل مواد "میرا سفر – 4 "سے لیا گیا ہے۔
74. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 43
75. میرا سفر – 4، صفحہ 487–493
76. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 43
77. وہی، صفحہ 64–65
78. میرا سفر – 4، صفحہ 496–500
79. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 14–15
80. میرا سفر – 5، صفحہ 502–504
81. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 75–76
82. میرا سفر – 4، صفحہ 487–493
83. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 80
84. جنب گزاریم جن سین – 2، صفحہ 118
85. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 16 اور 17

86. یہ زمین کیسے سنورے (غیر مطبوعہ)
87. پاکستان – کچھ حقائق کچھ شکایات، صفحہ 4
88. روبرو، صفحہ 94
89. میرا سفر، صفحہ 565
90. عوام اور بنیادی جمہوریتوں کے ممبران سے اپیل، صفحہ 3–8
91. لیڈرانِ کرام، صفحہ 20
92. میرا سفر – 5، صفحہ 595–596
93. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 17
94. میرا سفر – 5، صفحہ 591–592
95. وہی، صفحہ 564–565
96. روزنامہ عبرت، حیدرآباد، 22 ستمبر 1969
97. وہی، 7 اکتوبر 1969
98. وہی، 14 اکتوبر 1969
99. وہی، 16 ستمبر 1969
100. سندھ کی سیاست، صفحہ 168
101. میرا سفر – 5، صفحہ 580
102. سندھ کی سیاست، صفحہ 168–169
103. صبح سندھ، ہفت روزہ کراچی، 12 جولائی 1970
104. میرا سفر – 5، صفحہ 609–613
105. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 51
106. میرا سفر – 5، صفحہ 587
107. ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، صفحہ 51–53
108. سہ ماہی مہران، حیدرآباد، شمارہ 2 – 1962، اداریہ
109. موت کی چھاؤں تلے، صفحہ 39
110. مڑیا متھے مچ، صفحہ 22
111. وہی، صفحہ 22
112. موت کی چھاؤں تلے، صفحہ 39
113. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 20–21
114. میرا سفر – 5، صفحہ 566–567
115. وہی

116. وہی
117. مڑیا متھے مچ، صفحہ 31
118. وہی، صفحہ 32
119. وہی، صفحہ 33
120. موت کی چھاؤں تلے، صفحہ 39
121. سورن سندھی سیج (طلبہ کی تحریک)، صفحہ 27
122. وہی، صفحہ 28–29
123. میرا سفر – 5، صفحہ 591–594
124. صدر بھٹو کے نام زبان سے متعلق نوٹ
125. ملیر ڈائجسٹ، اگست 1972، صفحہ 20
126. میرا سفر – 5، صفحہ 591–592
127. وہی، صفحہ 595–596
128. وہی، صفحہ 615 تا 805

ماخذات

قاضی فیض محمد کی کتابیں

- سورن سندھی سیج، نواب شاہ، 1970
- بائیس سو بائیس ع، حیدرآباد، 1979
- جنسار، حیدرآباد، 1980
- دردن سندو داستان – جلد اول، نواب شاہ، 1980
- دردن سندو داستان – جلد دوم، نواب شاہ، 1982
- علامہ آئی آئی قاضی، حیدرآباد، 1981
- ہاری کمیٹی اور الاٹی تحریک، حیدرآباد، 1984
- Latiefi Sind in Search of Truth، نواب شاہ، 1979
- میرا سفر (غیر مطبوعہ)
- انجان (غیر مطبوعہ)

قاضی فیض محمد کی دیگر تحریریں

- فطرت کو جیسے میں نے دیکھا (مضمون)، سکرنڈ، 1979
- کرمن سندھی دلڑی (کتابچہ)، نواب شاہ
- سندھیوں کے لیے پیغام (مضمون)، کتاب: جی جوت جلائی ویا، حیدرآباد، 1981
- راولپنڈی زبان کانفرنس (تقریر)، ماہنامہ ملیر ڈائجسٹ، کراچی، اگست 1972
- چھنڈ چھان (مضمون)، ہفت روزہ صبح سندھ، کراچی، 9 اگست 1970

- اسلام: کچھ حقائق، کچھ شکایات (مضمون)، ہفت روزہ صبح سندھ، کراچی، 1970
- پاکستان: کچھ حقائق، کچھ شکایات (مضمون)، ہفت روزہ صبح سندھ، کراچی، 14 اگست 1970
- یونٹ نہیں ٹوٹا ہے (مضمون)، ہفت روزہ صبح سندھ، کراچی، 14 اگست 1970
- میرے پاس سودو سچ کا (انٹرویو)، ساہتی پبلیکیشن، 'رکیل لڑک'، کنڈیارو، 1980
- قاضی فیض محمد کا سندھ الاجی کو دیا گیا انٹرویو (کیسٹ(
- شیخ عبدالمجید سندھی (مضمون)، ماہنامہ پارس، مئی و جون 1984
- عوام اور بنیادی جمہوریتوں کے ممبران سے اپیل، نواب شاہ
- یہ زمین کیسے سنورے (مضمون)، غیر مطبوعہ
- ننھ اور بیداری (مضمون)، غیر مطبوعہ
- ایل ایم سی جامشورو میں 1981 میں کتابوں کی نمائش کے موقع پر کی گئی تقریر (انگریزی)، غیر مطبوعہ
- ایک نامعلوم مقام اور تاریخ پر کی گئی تقریر (انگریزی)، غیر مطبوعہ
- محمد علی ایم این اے کو 3 جون 1966 کو لکھا گیا خط
- ایک عظیم رہنما کی موت (مضمون)، کتاب: ہوندا سی حیات، حیدرآباد، 1978
- بشانی کے لیے خوش آمدیدی خطاب، نومبر 1957
- صدر بھٹو کے نام زبان سے متعلق نوٹ

قاضی فیض محمد کو موصولہ خطوط

- علامہ آئی آئی قاضی کے خطوط (شائع شدہ)، سورن سندھی سیج
- شیخ مجیب الرحمن کے 8 خطوط (غیر مطبوعہ)
- قمر الزمان (عوامی لیگ) کے 9 خطوط (غیر مطبوعہ)
- شمس الحق (عوامی لیگ) کے خطوط (غیر مطبوعہ)
- ذوالفقار علی بھٹو کے خطوط (غیر مطبوعہ)
- ممتاز علی بھٹو کے خطوط (غیر مطبوعہ)
- جی ایم سید کے خطوط (غیر مطبوعہ)
- مختلف سیاستدانوں کے خطوط (غیر مطبوعہ)

قاضی فیض محمد پر لکھے گئے مضامین و مقالات

- جی ایم سید، "جنب گزاریم جن سین – جلد دوم"، حیدرآباد، 1967
- ظفر عباسی، روزنامہ ہلال پاکستان، کراچی، 5 دسمبر 1982
- نبی بخش کوسو، روزنامہ ہلال پاکستان، کراچی، 15 اکتوبر 1982
- پیر علی محمد راشدی، روزنامہ جنگ، کراچی، 20 اکتوبر 1982
- ناز سنائی، "ماں کھاہوڑی ہلیا"، حیدرآباد، 1984
- صوفی غلام مصطفی، روزنامہ آفتاب، حیدرآباد
- ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سہ ماہی مہران، شمارہ 4، 1984

دیگر معاون کتب

- جی الانا، ہماری آزادی کے رہنما، کراچی، 1980
- میر امداد علی، سندھ کی سیاست، حیدرآباد، 1970

- علی محمد راشدی، وہ دن وہ شیر – جلد سوم، حیدرآباد، 1981
- منصور سارنگ (مرتب)، جی جوت جلائی ویا، حیدرآباد، 1981
- خان محمد پنہور (مرتب)، ہوندا سی حیات، حیدرآباد، 1978
- محمد امین کوسو، سندھ جو سید، نواب شاہ، 1969
- ریاض بٹالوی (مرتب)، لیڈرانِ کرام، لاہور، 1970
- محمود شام (مرتب)، روبرو، کراچی، 1970
- جی ایم سید، جنب گزاریم جن سین – جلد دوم، حیدرآباد، 1967
- جی ایم سید، منتخب سیاسی مضامین، کراچی، 1975
- جی ایم سید، آج بھی چکیم چاک، حیدرآباد، 1977
- جی ایم سید، کچھ خطوط، حیدرآباد، 1985
- رُک سندھی، بابائے سندھ کامریڈ حیدر بخش جتوئی، حیدرآباد، 1984
- رسول بخش پلیجو، مڑیا متھے مچ، کراچی، 1983
- غلام محمد لغاری، موت کی چھاؤں تلے (مضمون)، ماہنامہ سچ ڈائجسٹ، میرپور خاص، مارچ–اپریل 1970
- سہ ماہی مہراں، سندھ ادبی بورڈ، حیدرآباد، شمارہ 2، 1962
- روزنامہ عبرت، حیدرآباد، ستمبر و اکتوبر 1969 کے مختلف شمارے
- محمد موسیٰ بھٹو، سندھ میں بے چینی کے اسباب، حیدرآباد، 1975
- ناز سنائی، ماں کھاہوڑی ہلیا، حیدرآباد، 1984
- حیدر بخش جتوئی، ہاری انقلاب، حیدرآباد، 1985